اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

ستمبر ۲۰۱۸ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور
جلد ۲۲، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۱۸ء/ ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ

مشمولات

O تعلیم و تربیت
- سکول جلانا مسئلے کا حل نہیں — مدیر — ۵
- تحریکِ اصلاحِ تعلیم (ٹرسٹ) — ادارہ — ۷
  ہم کیا کر رہے ہیں، کیا کرنا چاہتے ہیں؟

O پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

* انتخابات ۲۰۱۸ء کا عمومی تجزیہ اور دینی جماعتیں
- انتخابات ۲۰۱۸ء ۔ پسِ پردہ گیم — ڈاکٹر محمد امین — ۹
- الیکشن ۲۰۱۸ء ۔ ایک جائزہ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۱۴
- پاکستان کے جمہوری انتخابات سے اسلامی امیدیں
  وابستہ کرنا کم عقلی اور شرک ہے — حامد کمال الدین — ۱۹

* جماعت اسلامی: شکست کے اسباب اور علاج
- جماعت اسلامی کو نشأۃ ثانیہ کی ضرورت ہے — ڈاکٹر محمد امین — ۲۹
- انتخابات اور جماعت اسلامی — پروفیسر ملک محمد حسین — ۳۷
- جماعت اسلامی اور جمہوریت کا سراب — اوریا مقبول جان — ۴۵
- جماعتِ اسلامی ۔ انحطاط اور احیاء — عبداللطیف گنڈاپور — ۴۸
- جماعت اسلامی کی شکست، زوال اور عروج کا راستہ — خلیل الرحمن چشتی — ۶۵
- جماعت اسلامی کی شکست ۔ تاریخ، وجوہات اور حل — محمد معاویہ — ۷۹
- فکرِ مودودی اور جماعت اسلامی — مجاہد حسین — ۹۱
- جماعت اسلامی کی شکست ۔ دل ہے کہ مانتا نہیں — نون الف — ۱۰۰
- احترام لازم ہے لیکن جماعت اسلامی الوداع — محمد حنیف — ۱۰۴
- جماعت اسلامی ۔ قیادت کی پھرتیاں — 'نقیب سحر' — ۱۰۷
- جماعت اسلامی کی صورتِ حال اور مستقبل کے لیے تجاویز — ابوالحسن علوی — ۱۰۸
- جماعت اسلامی کے دونوں کمیشنوں کے لیے چند تجاویز — ڈاکٹر محمد امین — ۱۱۲

ضمیمہ ①: اس امر کے شواہد وثبوت کہ مولانا مودودیؒ نے
۱۹۷۵ء میں انتخابی سیاسی جدوجہد سے مراجعت کر لی تھی

تعلیم و تربیت		مدیر

سکول جلانا مسئلے کا حل نہیں

غیرت مند خود اسلامی سکول کھولیں اور موجودہ سکولوں کو بدلیں

بلاشبہ ہمیں وہ تعلیم منظور نہیں جو ہماری بچیوں کو بے حیائی اور اسلامی اقدار کی مخالفت سکھائے

دیامر اور چلاس میں لڑکیوں کے کئی سکول جلا دیے گئے۔ حکمرانوں اور سیاستدانوں کے علاوہ دینی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے بھی اس کی مذمت کی۔ کسی نے سوچا کہ سکول کیوں جلائے گئے؟

اگر یہ سکول ان اسلامی انتہا پسندوں نے جلائے ہیں جو امریکہ، بھارت اور افغانستان کے اشارے پر پاکستان میں دہشت گردی کرتے ہیں اور پاکستان کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان کی مذمت کرتے ہیں اور حکومت پاکستان اور افواج پاکستان سے گزارش کرتے ہیں کہ ان کا قلع قمع کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزشت نہ کریں۔ لیکن اگر یہ سکول ان مقامی دین دار لوگوں نے جلائے ہیں جو لڑکیوں کی جدید تعلیم کے اس لیے خلاف ہیں کہ وہ بے حیائی سکھاتی ہے اور انہیں اسلامی اقدار کی مخالفت پر اکساتی ہے تو ہم انہیں کہتے ہیں کہ ان کا طریق کار غلط ہے۔ سکول جلانا اس مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ حکومت پھر سکول بنا دے گی۔ وہ کب تک سکول جلاتے رہیں گے اور جیلوں میں سڑتے رہیں گے؟ اس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ:

❁ وہ خود ایسے سکول کھولیں جو اسلامی اصول و اقدار کی پاسداری کریں۔

❁ وہ علاقے کے دین دار لوگوں کو متوجہ کریں کہ وہ اسلامی اقدار کی پاسبانی کرنے والے سکول کھولیں کیونکہ ایسے سکول کھولنے پر حکومت یا کسی بھی ادارے کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔

❁ وہ خود کو منظم کریں۔ ہم خیال افراد کو ساتھ ملا کر وہ کوئی ادارہ یا تنظیم یا این جی او بنا لیں اور وفد بنا کر موجودہ سکول مالکان کے پاس جائیں اور انہیں خدا کا خوف دلائیں کہ وہ اپنی بچیوں کو مغرب زدہ تعلیم نہ دیں جو انہیں بے حیائی سکھائے اور غیر اسلامی اقدار سکھائے

بلکہ یہ ان کی دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم میں اسلامی اصول و اقدار کی پابندی کریں۔

❁ انہیں یہ بھی چاہیے کہ وہ موجودہ سکول مالکان کی مدد کریں کہ وہ ایسی نصابی کتابوں کا انتخاب کریں جو اسلامی اقدار کے مطابق ہوں۔ وہ سکول میں بچوں کی اسلامی تربیت کے لیے بھی سکول مالکان/ پرنسپل صاحبان کی مدد کریں۔

یہ ہیں دین دار لوگوں کے کرنے کے کام۔ یہ کام پُر امن ہیں، تعمیری ہیں، سائنٹفک ہیں۔ کسی میں ہمت نہیں کہ ان کی مخالفت کرے لیکن اکثر دین دار لوگ یہ کام نہیں کرتے البتہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا نظام تعلیم غیر اسلامی ہے، یہ غیر اسلامی اصول و اقدار کو فروغ دیتا ہے اور بچوں بچیوں کو اسلام سے دور کرتا ہے۔ انہیں چاہیے کہ صحیح رُخ میں کام کریں اور تعلیم کو اسلام کے مطابق بنانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

اکثر ماڈرن دانشور شکایت کرتے ہیں کہ بلوچستان اور سرحد میں بچیوں کی شرح تعلیم بہت کم ہے۔ وہ اسے پس ماندگی کی علامت سمجھتے ہیں اور اسے والدین کی قدامت پرستی اور روایت پرستی کا نتیجہ سمجھتے ہیں کہ وہ بچیوں کو تعلیم نہیں دلانا چاہتے۔ لیکن اصل بات کی طرف ان کی توجہ نہیں جاتی جو یہ ہے کہ قبائلی علاقہ حمیت وغیرت کے اسلامی معیارات سے کمپرومائز نہیں کرتا جب کہ شہروں اور میدانی علاقوں کے لوگ غیر اسلامی مغربی اقدار کو ردّ کرنے میں اتنی حمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے جتنی خیبر پی کے اور بلوچستان کے قبائلی لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس پر تشجیع، حوصلہ افزائی اور مبارکباد کے مستحق ہیں نہ کہ مخالفت و مذمت کے۔ البتہ ان کا طریق کار غلط ہے جس کی نشاندہی ہم نے کردی ہے۔

ہم ملک کی دینی قوتوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری معروضات پر غور فرمائیں۔ خصوصاً خیبر پی کے اور بلوچستان میں کام کرنے والی دینی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ ہماری گزارشات کو سنجیدگی سے لیں اور اپنے علاقے میں اسلامی تعلیم کے لیے جدوجہد کریں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

تحریکِ اصلاحِ تعلیم (ٹرسٹ)

ہم کیا کر رہے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں؟

تعلیم میں علمی وفکری کام　　[تصانیف ڈاکٹر محمد امین]

۱۔ جدید تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنا

- ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل　　- اسلامی سکول کے خدوخال
- تعلیم اور اس کا اسلامی کردار　　- تدریس القرآن ① برائے اساتذہ وطلبہ

۲۔ طلبہ کی اسلامی تربیت

- تعلیمی ادارے اور کردار سازی　　- تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت (ہینڈ بک وگائیڈ)

۳۔ دینی مدارس کے نظام تعلیم کی اصلاح

- ہمارا دینی نظام تعلیم　　- نصابِ مدنی

۴۔ تعمیر سیرت و تزکیۂ نفس

- اسلام اور تزکیۂ نفس　　- حقیقت تزکیۂ نفس

۵۔ ماہانہ البرہان (اگست ۲۰۱۰ء سے اجراء)

دیگر سرگرمیاں

- تعلیمی ورکشاپس　- نصاب سازی ونصابی کتب کی تیاری، تعلیمی کانفرنسیں اور سیمینارز
- تربیت اساتذہ　- لٹریچر کی تیاری

دینی تعلیم

- فارغ التحصیل طلبہ کے لیے کورسز　　- تربیت اساتذہ
- سارے مسالک کے علماء کی علمی مجلس　- دینی مدارس کے لیے نیا نصاب

مستقبل کے منصوبے (جن پر کام جاری ہے)

- ماڈل یونیورسٹی کا قیام
- ماڈل سکول کا قیام
- سکول چین
- سکولوں کے لیے نصابی کتب

تعلیم کے اسلامی کردار کا فہم اور درد رکھنے والوں سے تعاون کی درخواست ہے

رابطہ

ڈاکٹر محمد امین
0300-4354673

پروفیسر ملک محمد حسین
0333-4404260

کیا سناتا ہے مجھے ترک وعرب کی داستان
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز وساز

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز!

لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سی پارس
وہ مئے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز

حکمتِ مغرب سے ملّت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کردیتا ہے گاز

ہوگیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کالہو
مضطراب ہے تُو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر محمد امین

پاکستانی سیاست۔پسِ پردہ گیم

بعض سیاسی حلقوں اور دینی سیاسی جماعتوں کی شکست کی تفہیم کا ایک پہلو

❁ البرہان اصلاً ایک تعلیمی جریدہ ہے لیکن ہمارے نظام تعلیم پر چونکہ مغرب اور مغربی فکروتہذیب اثر انداز ہوتی ہے اس لیے وہ بھی ہمارے مطالعے کا جزو بنتی ہے۔ اسی طرح پاکستان میں جو حکومت آئے اس کی فکر اور پالیسیاں بھی تعلیم پر اثر انداز ہوتی ہیں اس لیے ہمیں ان سے بھی محدود دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن تعلیم کے اسلامی کردار کا انحصار چونکہ اس پر ہے کہ کوئی ایسی حکومت آئے جو سیکولر نہ ہو بلکہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو لہٰذا پاکستان میں غلبۂ اسلام اور دینی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد بھی ہماری دلچسپی کا موضوع بنتی ہے اور ہم البرہان میں اس پر سوچ بچار کرتے رہتے ہیں۔

❁ انتخابات ۲۰۱۸ء میں حسبِ معمول بعض سیاسی جماعتیں اور حسبِ توقع ساری دینی سیاسی جماعتیں شکست کھا گئیں۔ اس شکست کے بنیادی اسباب داخلی اور فکری ہیں جو الگ اور مستقل مکالمہ اور مباحثہ چاہتے ہیں جو یہاں ہمارے پیش نظر نہیں۔ یہاں ہم بحیثیتِ مجموعی پاکستانی سیاست کے پیچ وخم کو سمجھنا چاہتے ہیں جس میں مسلم لیگ (ن)، اس کے حمایتیوں اور ساری دینی سیاسی جماعتوں (جمعیت علماء اسلام [ف۔س۔ح]، جماعت اسلامی، تحریک لبیک، جمعیت علماء پاکستان کے مختلف دھڑوں، تحریک اللہ اکبر [ملی مسلم لیگ/ جماعۃ الدعوۃ]، مرکزی جمعیت اہل حدیث، اہل تشیع کی جماعتیں وغیرہ سب) کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

❁ ہم جو تبصرہ پیش کررہے ہیں وہ ہمارے مشاہدے، مطالعے اور تجزیے کا نچوڑ ہے لیکن اس میں غلطی کا امکان موجود ہے اور اس سے اختلاف بھی ممکن ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ملک کے سیاسی اور دینی حالات کی صحیح تفہیم ہے تاکہ دینی قوتیں مستقبل میں صحیح لائحہ عمل اختیار کرسکیں۔

❁ اس وقت ورلڈ پاور امریکہ (اپنے حلیفوں سمیت جن میں یورپ، اسرائیل، بھارت

وغیرہ شامل ہیں) بلاشبہ اسلام مخالف اور مسلم دشمن ہے۔اس کے دلائل رشواہد بے شمار ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ بہر حال مسلم ممالک بشمول پاکستان اس کی پالیسی یہ ہے کہ اوّل تو امریکہ پوری کوشش کرتا ہے اور اس کی مکمل منصوبہ بندی کرتا ہے کہ ہر مسلمان حکمران اس کی مٹھی میں رہے، اس کے مفادات کا تحفظ کرتا رہے اور اس کی پالیسیاں اپنے ہاں نافذ کرتا رہے تاہم اگر کسی وقت کوئی حکمران اس کے قابو نہ آئے تو وہ فوجی قیادت کو اس کے خلاف استعمال کرتا ہے اور سول حکومت کا تختہ الٹوا دیتا ہے اور اپنی مرضی کا فوجی حکمران برسراقتدار لے آتا ہے۔اور اگر کبھی فوجی قیادت اس کے احکام ماننے میں پس وپیش کرے تو امریکہ سیاسی اور جمہوری حکمرانوں کو فوجی قیادت کو دبانے اور بدلوانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔غرض یہ کہ جو فریق بھی اس کا ساتھ دینے میں لیت ولعل سے کام لے وہ اسے دوسرے فریق یا فریقوں سے پٹوا دیتا ہے۔اور اس میں وہ بہت حکمت اور باریک بینی سے کام لیتا ہے، لوگوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتا ہے، ان کی خواہشوں، تمناؤں، حبّ جاہ ومال کے رویوں بلکہ ان کے خوابوں کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ پاکستان میں اسے پرویز مشرف کی صورت میں Two in one مل گیا جو بیک وقت فوجی بھی تھا اور سیاسی بھی لیکن جب وہ بہت بدنام اور کمزور ہو گیا اور اسے بدلنا ضروری ہو گیا تو اس کی جگہ زرداری اور نواز شریف کی صورت میں ایسی سول حکومت لائی گئی جو امریکہ کے مطالبات پورے کرنے کو تیار تھی۔ جب سول حکومت کو دبانا مقصود تھا تو پشاور آرمی سکول میں دھماکہ کرایا گیا اور دہشت گردی کو روکنے کے نام پر فوج کو بالا دستی دلوا دی گئی اور فوجی عدالتیں بنیں اور نیشنل ایکشن پلان بنے۔ اور جب فوجی قیادت کی پالیسیاں اسے چبھنے لگیں تو نواز شریف کی سول حکومت کو فوج سے لڑا دیا۔فوج نے جب اپنا اور ملک کا مفاد اس میں دیکھا کہ سول حکومت کی چھٹی ضروری ہے تو اس نے عدلیہ کو ساتھ ملا لیا اور نواز شریف کی چھٹی کرادی۔ پھر مغرب نے نواز شریف کو علی الاعلان فوج اور عدلیہ کے خلاف کھڑا کر دیا اور انہیں خوب گالیاں دلوائیں۔

ان حالات میں الیکشن ہوئے اور اسٹیبلشمنٹ نے مسلم لیگ (ن) اور ان کے حمایتیوں (اے این پی، مولانا فضل الرحمن اور محمود اچکزئی) کو ہروا دیا اور عمران خان کو جتوا دیا لیکن اس طرح جتوایا کہ وہ آرام سے حکومت نہ کر سکے۔اسے صرف اتنی اکثریت ملی جس سے

وہ رو پیٹ کر حکومت بنا سکا اور اپوزیشن اتنی مضبوط ہے کہ وہ ہمیشہ اس کا ناک میں دم کیے رکھے گی اور اسے سکون سے حکومت نہ کرنے دے گی۔ لہٰذا وہ بھی من مانی نہیں کر سکے گا اور اسٹیبلشمنٹ کی مدد کا محتاج رہے گا اور زیادہ ڈیلیور بھی نہیں کر سکے گا۔

دینی جماعتوں کے حالات دیکھیے۔ مولانا فضل الرحمن، نواز شریف حکومت کا حصہ تھے (اور وہ کون سی حکومت ہے جس کا وہ حصہ نہیں رہے۔ جس طرح ماٹھے سکول سارا سال 'Admissin open' کا اشتہار لگائے رکھتے ہیں، اسی طرح مولانا ہمیشہ Open for sale کا بورڈ لگائے رکھتے ہیں اور ہر حکومت میں جا شامل ہوتے ہیں اور کسی وزارت اور کمیٹی کی سربراہی لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف ان کا (اور محمود اچکزئی کا) فاٹا کے انضمام کی مخالفت کرنا اس لیے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ امریکی گیم کا ایک حصہ تھا۔ امریکی نہیں چاہتے تھے کہ فاٹا کا خیبر پی کے میں انضمام ہو کیونکہ اس طرح وہ ان کے لیے کھلی چراگاہ نہ رہتا اور اس میں فساد اور دہشت گردی کے بیج بونا اس کے لیے آسان نہ رہتا۔ اس طرح مولانا فضل الرحمن ISI کے مقابلے میں CIA کی حمایت میں چلے گئے اور نواز شریف کی کرپشن، نااہلی اور عدالتوں سے سزا کے باوجود آج بھی اس کے حمایتی ہیں لیکن یہاں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کامیاب رہی اور اسے امریکی سی آئی اے اور بھارتی را کے پاکستان میں سیاسی منصوبوں کو ناکام بنانے میں کامیابی ملی اور نواز شریف اپنے حمایتیوں سمیت انتخابات میں ناکام ٹھہرے۔

اسٹیبلشمنٹ کی یہ چال بھی قابل تفہیم ہے کہ اس نے تحریک لبیک اور تحریک اللہ اکبر (ملی مسلم لیگ/ جماعۃ الدعوۃ) جیسی مسلکی مذہبی جماعتوں کو ابھارا تا کہ وہ نواز شریف کے ووٹ کاٹ سکیں اور انھوں نے کاٹے لیکن اسٹیبلشمنٹ نے انہیں کھل کھیلنے اور جیتنے بھی نہیں دیا کیونکہ ماضی میں کراچی میں ایم کیو ایم کو کھڑا کرنے اور جتوانے کا اس کا تجربہ ناکام ثابت ہوا تھا جس نے توانا ہو کر خود ریاست اور اسٹیبلشمنٹ کی اتھارٹی کو چیلنج کر دیا تھا اور امریکی سی آئی اے اور بھارتی را کے ہاتھوں میں کھیلنے لگی تھی۔

جماعت اسلامی کی مجبوری یہ تھی کہ اس کی قیادت کو پتا تھا کہ اس کا ووٹ بنک ختم ہو چکا ہے لہٰذا وہ انتخابات میں سہارے کی متلاشی تھی۔ وہ اپنی احمقانہ پالیسیوں کی وجہ سے مسلم لیگ

ن کو بھی ناراض کر چکی تھی اور تحریک انصاف سے بھی ناخوش تھی لہٰذا اس نے سوچا کہ مولانا فضل الرحمن کے ساتھ مل کر ایم ایم اے بحال کر لی جائے تا کہ اسے ملک بھر سے مذہبی ووٹ ہی مل جائے لیکن وہ یہ ادراک نہ کر سکی کہ ایم ایم اے کی پچھلی حکومت اسلامی لحاظ سے کچھ بھی ڈیلیور نہ کر سکی تھی اور عوام ان کی کارکردگی سے مایوس ہوئے تھے۔ پھر اس دفعہ مولانا فضل الرحمن مقامی اسٹیبلشمنٹ کو مخالف بنا چکے تھے لہٰذا ایم ایم اے کامیاب نہ ہو سکی۔ سراج الحق صاحب کو اس چیز کی سزا ملی کہ وہ اتنا بھی ادراک نہ کر سکے کہ بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ اور مقامی اسٹیبلشمنٹ کی لڑائی میں مولانا فضل الرحمن کی پوزیشن کیا تھی لہٰذا انہیں مولانا فضل الرحمن کی حمایت کی سزا دی گئی۔ ویسے بھی جمعیت علماء اسلام (ف) اور جماعت اسلامی کو حصہ بقدر جُثّہ نشستیں مل ہی گئیں بلکہ ن لیگ اور پی پی پی کو بھی مل گئیں لہٰذا دھاندلی کا شور زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ سراج الحق صاحب کو اس صورتِ حال کا ادراک الیکشن ہرنے کے بعد ہوا اور وہ مولانا فضل الرحمن کی حمایت سے دستکش ہو گئے لیکن اب کیا فائدہ؟ بلکہ اس پر تو یار لوگ وہی پھبتی کَس رہے ہیں کہ "نانی نے خصم کیا بُرا کیا، کر کے چھوڑ دیا اور بھی بُرا کیا۔"

یہ ہے پاکستان کی مجموعی سیاسی صورت حال اور ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں دینی جماعتوں کی شکست کے بارے میں ہمارا تجزیہ۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ یہ تصویر کا محض ایک رُخ ہے۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں اور دینی سیاسی جماعتوں کے اپنے میرٹ اور ڈی میرٹ ہیں جو ان کی انتخابی فتح و شکست میں زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں، جنہیں ہم یہاں زیر بحث نہیں لا رہے۔

یہ بحث سمیٹنے سے پہلے ہم دو باتیں عرض کرنا چاہیں گے:

ایک: یہ کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں بحیثیت مجموعی ساری سیکولر ہیں لہٰذا ان میں سے کسی ایک کے جیتنے یا ہارنے سے ملک اور معاشرے کے اسلامی مستقبل پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ عموماً توقع کی جاتی ہے کہ عمران خان دوسری سیاسی جماعتوں سے کچھ بہتر ہیں۔ اس کا صحیح اندازہ تو کچھ عرصہ بعد ان کی کارکردگی دیکھ کر ہی ہوگا تاہم اس سلسلے میں ہم زیادہ پراُمید نہیں ہیں کیونکہ ان کے پاس ٹیم ہی نہیں ہے جو تبدیلی لا سکے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح کی جمہوریت یا برائے نام ’اسلامی جمہوریت‘ پاکستان میں رائج ہے اس میں اور فوجی آمریت یا اسٹیبلشمنٹ کے کردار کے حوالے سے بھی ہم کوئی زیادہ حساس نہیں ہیں اور نہ اس میں زیادہ فرق محسوس کرتے ہیں۔ مغرب زدہ تعلیم اور میڈیا کی وجہ سے اور مغربی فکر و تہذیب کے دنیا پر عمومی غلبے کی وجہ سے موجودہ دنیا کے ہر فرد کے دل و دماغ میں (خواہ وہ مسلمان اور پاکستانی ہو یا غیر مسلم اور دنیا کے کسی بھی براعظم میں بستا ہو) ’جمہوریت‘ کا تقدس ثبت کر دیا گیا ہے اور اس تقدس کے سحر سے ہم جیسے صرف تھوڑے سے مسلمان ہی بچے ہوئے ہیں جن کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ بہر حال ہم اپنے موقف کو صحیح سمجھتے ہیں اور اسے دہراتے رہیں گے کہ مغرب کی جمہوریت اسلامی نہیں ہے اور مغرب کی لادین سرمایہ دارانہ جمہوریت کو جس طرح پاکستان میں ’اسلامی جمہوریت‘ میں بدلا گیا ہے وہ بھی فریبِ فکر و نظر ہے۔ اور یہ کہ پاکستان کی سیاسی جمہوری سیکولر جماعتیں، ہماری رائے میں، ہر گز پاکستان کے بائیس کروڑ غریب اسلام پسند عوام کی صحیح نمائندگی نہیں کرتیں خواہ وہ الیکشن جیت کر بھی آئیں کیونکہ یہ سارا سیاسی نظام ہی کرپٹ، غیر حقیقی اور غیر اسلامی ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ دین کے نام پر سیاست کرنے والی دینی سیاسی جماعتیں بھی غیر حقیقی اور غیر نمائندہ ہیں اور وہ اپنی ناقص پالیسیوں کی وجہ سے ڈیلیور بھی نہیں کر سکیں۔ لہٰذا وہ بھی ناکام ہو چکی ہیں اور عوام الناس کنفیوز ہیں کہ وہ ’اسلام‘ کے نام پر کسے ووٹ دیں اور کون اس ملک میں اسلام کی حقیقی تعلیمات کو جاری و ساری کر سکتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم آمریت یا فوجی حکومت کے حامی ہیں۔ ہر گز نہیں! ہمارا موقف یہ ہے کہ ہمیں اسلام کی سیاسی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے (نہ کہ مغرب کی سیاسی فکر کو سامنے رکھتے ہوئے) اسلام کا ایسا سیاسی نظام وضع کرنا چاہیے جو ہماری عصری ضرورتوں کو پورا کرتا ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے اور قابل عمل ہے لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ نہ ہمارے علماء اور اسلامی سکالرز اس کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ ہمارے سیاستدان اس کے لیے تیار ہیں۔ ہم بہر حال اپنی بات دلائل کے ساتھ سامنے لاتے رہیں گے۔

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

پروفیسر ملک محمد حسین [1]

الیکشن ۲۰۱۸ء - ایک جائزہ

الیکشن ہوگئے، پارٹی پوزیشن واضح ہوگئی، اسمبلیوں کے اراکین نے حلف اٹھالیا، حکومتیں بن گئیں، جمہوریت ایک قدم آگے بڑھ گئی لیکن بنیادی سوالات کے جوابات ابھی آنا باقی ہیں۔ یہ بنیادی سوالات کیا ہیں؟ ان کا نقشہ کچھ یوں بنتا ہے:

کیا الیکشن ۲۰۱۸ء آزادانہ اور منصفانہ تھے؟ اگر آزادانہ اور منصفانہ تھے تو تحریک انصاف کے سوا باقی تمام سیاسی جماعتیں اتنا شور وغوغا کیوں کررہی ہیں؟ الیکشن کمیشن کے بعض فیصلے اور اعلیٰ عدالتوں کی متنازعہ مداخلت کیا تاثر چھوڑ رہی ہے؟ اگر مذکورہ الیکشن آزادانہ اور منصفانہ نہیں تھے تو اس میں کن کن قوتوں اور کن کن اداروں کا کیا کردار نظر آتا ہے؟

ہم مذکورہ سوالات اور ان کے جواب پر کوئی قولِ فیصل نہیں دے سکتے لیکن بقول چیف جسٹس آف پاکستان کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ تو ہوا ہے۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں قومی انتخابات میں ہمیشہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہے۔ برادریاں اثر انداز ہوتی ہیں، روپیہ پیسہ اپنا اثر دکھاتا ہے۔ چمک کے دیگر ذرائع بھی کام کرتے ہیں۔ قومی مفاد بھی بروئے کار آتا ہے جس کے حصول کے لیے پس پردہ قوتیں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اس دفعہ تو یہ پس پردہ قوتیں کافی کھل کر کھیلی ہیں۔ شاید پہلے بھی ایسا ہوتا ہو لیکن اس دفعہ نواز شریف کے بیانیے کی وجہ سے میڈیا کو اور عام لوگوں کو کچھ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ ۲۰۰۲ء کی حکومت کی تشکیل کے وقت یار دوستوں کے اعلیٰ نمائندے کا کردار جس طرح اعزاز سید نے اپنے ایک کالم میں طشت از بام کیا ہے اس کے بعد خیال آرائی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بہر حال قومی مفاد ہر شے پر فائق اور ہر صورتِ حال میں غیر متنازع ہونا چاہیے۔

الیکشن ۲۰۱۸ء میں مسلم لیگ ن بظاہر ہاری، پیپلز پارٹی نے اپنی اسمبلیوں میں نمائندگی میں اضافہ کیا اور پی ٹی آئی ہارنے سے بال بال بچی اگرچہ اس کی جیت بھی بہت زیادہ قابل فخر نہیں ہے۔ کیفیت ایسی ہے کہ سیڑھی کسی بھی وقت کھینچی جاسکتی ہے۔ بعض نمایاں سیاسی قائدین

[1] نائب مدیر البرہان، ماہر تعلیم، دانشور، تجزیہ کار

کا دھڑن تختہ ہو گیا اور مذہبی سیاسی جماعتیں قومی منظر نامہ سے تقریباً غائب ہوتی نظر آتی ہیں۔ جمعیت علماء اسلام نے کچھ اپنا بھرم قائم رکھا اگرچہ مولانا فضل الرحمن کی شکست نے اس بھرم کو بھرم نہیں رہنے دیا۔ تحریک لبیک پاکستان اور ملی مسلم لیگ نے اپنا دیا گیا رول کامیابی سے ادا کیا اگرچہ خود تہی دامن رہیں۔ تحریک لبیک کا عنصر ایک عرصے تک پاکستان کی فرقہ وارانہ سیاست میں اپنا زہر گھولتا رہے گا جس طرح مخصوص مقاصد کے لیے قائم کیے گئے گروہ مثلاً ایم کیو ایم، لشکر جھنگوی، سپاہ صحابہ اور جیش محمد وغیرہ قومی زندگی کے عدم استحکام میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ جماعت اسلامی الیکشن میں پہلے بھی پٹتی رہی ہے لیکن اس دفعہ تو یہ پٹائی اپنی آخری حد تک پہنچی۔ اس کا تفصیلی ذکر ہم کسی اور جگہ کریں گے، پہلے مسلم لیگ ن کی حزیمت کا ذکر کرتے ہیں۔

ن لیگ برسر اقتدار تھی اور برسر اقتدار جماعت سے لوگوں کے گلے شکوے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ن لیگ کی کارکردگی نے ان گلوں شکوؤں کو بہت حد تک نیوٹرالائیز کیا الیکشن قوانین میں اٹھنے والے ختم نبوت کے ایشو نے مسلم لیگ ن کو وسیع بنیادوں پر نقصان پہنچایا۔ اگرچہ ختم نبوت کے مسئلہ والی غلطی سب سیاسی جماعتوں کی مشترکہ غلطی تھی جس کی نشان دہی بجا طور پر مولانا فضل الرحمن اور مولانا منیب الرحمن نے اپنے تفصیلی اخباری مضامین میں فرمائی لیکن ن لیگ کی مخالف سیاسی اور مذہبی قوتوں نے بڑی کامیابی سے یہ کالک مسلم لیگ ن کے ماتھے پر مل دی۔ میڈیا نے بھی اس پروپیگنڈے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اور شاید بعض نادیدہ قوتوں نے بھی اسے ہوا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ ن کے خلاف ایک فضا بن گئی۔ تحریک لبیک والوں نے اس مسئلہ میں اپنا فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ فیض آباد کا دھرنا اور اس کے بعد کے اثرات نے مسلم لیگ ن کو دفاعی پوزیشن پر لا کھڑا کیا۔ ختم نبوت کے ایشو کے نتائج مسلم لیگ ن کے لیے بہت تباہ کن ہونا تھے لیکن نواز شریف کے بیانیے نے معاونت کی اور صورتِ حال مکمل تباہی سے بچ گئی۔

عمران خان کی مستقل مزاجی اور میڈیا کا کردار

عمران خان نے مستقل مزاجی سے مسلم لیگ ن اور خاص طور پر نواز شریف پر تابڑ توڑ حملے بڑی مستقل مزاجی سے جاری رکھے۔ جھوٹے یا سچے الزامات جو بھی تھے عمران خان نے بڑی بلند آہنگی سے اٹھائے رکھے اور سچ تو یہ ہے کہ میڈیا نے عمران خان کا بھرپور ساتھ دیا۔ کوئی ایک بھی ٹی وی چینل ایسا نہ تھا جس نے عمران خان کی گالی گلوچ کو پوری کوریج نہ دی ہو

بلکہ اس کوریج کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کیا ہو۔ جیو نیوز پر الزام تھا کہ ن لیگ کا حامی ہے وہ بھی طوعاً کرھاً دوسرے ٹی وی چینلز کی اتباع کرتا رہا۔

نیب اور عدالتوں کا کردار

اس دفعہ نیب نے بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ یہ کردار واضح طور پر جانبدارانہ نظر آیا۔ پانامہ کیس، اقامہ کا فیصلہ اور آخر میں احتساب عدالت کی طرف سے نواز شریف کو سزا نے انتخابات کو کم از کم آزادانہ نہیں رہنے دیا۔ نیب اور عدالتوں کے فیصلوں نے مسلم لیگ کے خلاف ایک فضا پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اڑنے والے سیاسی پرندے زیادہ تر اسی فضا سے متاثر ہوئے۔ پرندے تو ہمیشہ خوشگوار موسم کے متلاشی ہوتے ہیں اور جب ن لیگ کا موسم انہیں ناخوشگوار ہوتا نظر آیا تو اڑان بھر گئے۔ جنوبی پنجاب کا ڈرامہ تو بس ڈرامہ ہی تھا اور نظر آتا ہے کہ اگلے الیکشن تک یہ ڈراما چلتا رہے گا۔ وجہ یہ ہے کہ دیگر صوبوں کے مطالبے بھی تو منہ کھولے کھڑے ہیں۔ جب ایک صوبے کا جنّ باہر آئے گا تو باقی صوبوں کے جنّ کس طرح قابو میں رہیں گے۔ ویسے پاکستان میں قومی اتفاق رائے سے صوبوں کی تقسیم کے سلسلہ میں عاقلانہ اور عادلانہ فیصلے ہونے چاہئیں اور اس مسئلہ پر قوم کو انتشار میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے۔

روپے پیسے کا کردار

ہمارے انتخابات میں روپے پیسے کا کردار ہمیشہ رہا ہے اور اس دفعہ بھی کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ میرے اپنے آبائی صوبائی حلقہ میں زر اور زور دونوں نے خوب جلوہ دکھایا۔ زر جیتا اور زور بھی ہارا نہیں۔ زردار اپنی لوٹی ہوئی دولت کا ایک حصہ انتخابی کاروبار میں لگاتے ہیں اور منتخب ہونے کے بعد کثیر منافع کے ساتھ اصل زر بھی واپس لے لیتے ہیں۔ دیہاتوں کے چوہدری اور برادریوں کے سردار بھی تمتع حاصل کرتے ہیں۔ میرے حلقہ کے سابق رکن قومی اسمبلی جب حالیہ انتخاب میں ووٹ مانگنے آئے تو لوگوں نے کسی قسم کا ترقیاتی کام نہ کرانے کا گلہ کیا۔ موصوف کہنے لگے آپ جلسۂ عام کریں تو میں کھلے جلسے میں بتاؤں گا کہ میں نے آپ کے نمائندوں کو ترقیاتی کاموں کے لیے ایک کروڑ روپے دیے اور اگر وہ خود ہی کھا گئے تو میرا کیا قصور؟ ساتھ ہی دس لاکھ نقد نکال کر اپنے حامیوں کے سربراہ کو پیش کر دیے کہ آپ کی واٹر سپلائی کا جو مسئلہ ہے اُسے آپ اس رقم سے حل کر لیں۔ یہ اگرچہ ایک حلقے کی کہانی ہے لیکن اصل میں یہ تقریباً تمام حلقوں کی کہانی ہے۔

فرقہ وارانہ مذہبی گروہوں کا کردار

فرقہ وارانہ مذہبی گروہ ہمارے معاشرے کی حقیقت ہیں۔ سلفی، دیوبندی، بریلوی، شیعہ اور ان مین سٹریم فرقوں کے ذیلی گروہ جو ہر گاؤں، محلہ اور مسجد کی بنیاد پر موجود ہیں، اپنا اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ پیران کرام اور مشائخ عظام بھی اپنے وسیع حلقہ اثر کی وجہ سے سیاسی قوت کا اظہار کرنے سے پیچھے نہیں رہتے۔ ان انتخابات میں بھی دیکھا گیا کہ سب بڑی سیاسی جماعتوں نے علماء کرام اور مشائخ عظام کے کنونشن منعقد کیے۔ سیاسی جماعتیں اپنے مقاصد کی خاطر اور نادیدہ قوتیں قومی مفاد کی خاطر مذہبی فرقہ واریت کو ہوا دیتی رہتی ہیں اور پھر انہیں معاشرے میں توازن لانے کی خاطر استعمال کرتی ہیں۔ آئے دن مذہبی گروہ بندی میں اضافہ اور معاشرتی انتشار کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ ایک طرف مذہبی گروہوں کا مفاداتی مسئلہ ہے تو دوسری طرف متعدد سیاسی وغیر سیاسی قوتوں کا عمل دخل بھی ہے۔ بہرحال انتخابات میں مذہبی گروہ بندی نے بظاہر پاکستان تحریک انصاف کو فائدہ پہنچایا جب کہ پہلے ہمیشہ مسلم لیگ اس سے تمتع حاصل کرتی تھی۔ انتخابی سیاست میں فرقہ واریت کا سب سے زیادہ نقصان جماعت اسلامی اٹھاتی ہے جب کہ سب سے زیادہ فائدہ جمعیت علماء اسلام کے حصہ میں آتا ہے۔ اب اگر تحریک لبیک والوں کو پشت پناہی حاصل رہی تو شاید بریلوی حضرات کا یہ گروہ قابل ذکر سیاسی گروہ بن جائے۔ ملی مسلم لیگ جماعت الدعوۃ والوں کا نیا چہرہ ہے۔ یہ گروہ بقول محترم حافظ سعید صاحب گلی کوچوں تک نظر یہ پاکستان کا پیغام تو عام کرتا رہے گا لیکن کوئی سیاسی کامیابی بھی حاصل کرے اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا! ہمارے شیعہ بھائی مؤثر پریشر گروپ تو ہیں اور ایک سیاسی لابی بھی بناتے ہیں لیکن بوجوہ مؤثر سیاسی قوت نہیں بن سکے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ سب مذہبی فرقے اور ان فرقوں کے ماننے والے اپنی اپنی سیاست مین سٹریم سیاسی جماعتوں میں شامل ہو کر قومی مفاد کے پروگراموں کو سامنے رکھ کر کریں اور فرقہ واریت کے نعروں سے اجتناب کریں۔ اسلام کا حسن اتفاق میں ہے انتشار میں نہیں۔ اگر یہ ممکن ہو تو پارلیمنٹ قانون سازی کے ذریعے فرقہ واریت پر مبنی سیاست اور سیاسی نعروں کو ممنوع قرار دے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے نفاذ کے بعد سے مذہبی سیاست کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جب مان لیا گیا کہ ریاست کا مذہب اسلام ہے، اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ملک کا کوئی قانون قرآن وسنت کی تعلیمات کے برعکس نہیں بن سکتا تو جو اب کرنے کا کام ہے وہ یہ ہے کہ آئین کی ان شقوں پر عمل کیا جائے۔ عمل کرانے والے دیانتدار عمال کے لیے تعلیم وتربیت اور تزکیہ کے ذریعے انسان سازی کی

جائے اور ملک میں قرآن وسنت کی حکمرانی قائم کی جائے۔ اس کے لیے علمائے کرام اور مشائخ عظام خود سیاست میں کودنے کی بجائے مقتدر سیاسی جماعتوں کے لیے پریشر گروپ کا کام کریں اور ہیئت مقتدرہ کو مجبور کریں کہ وہ آئین پاکستان پر حقیقی روح کے مطابق عمل کریں۔

حالیہ انتخابی نتائج کے ممکنہ اثرات

اگرچہ تینوں مین سٹریم سیاسی جماعتیں یعنی پیپلز پارٹی، مسلم لیگ ن اور پی ٹی آئی اپنی اٹھان کے لحاظ سے لبرل سیکولر جماعتیں ہیں لیکن پی ٹی آئی جس طرح پچھلے ۶، ۷ سالوں میں ابھر کر سامنے آئی ہے اس سے اس کا لبرل سیکولر چہرہ زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ یوتھ اور خواتین کی پسندیدگی کی زیادہ وجہ بھی پی ٹی آئی کا لبرل چہرہ ہے۔

ہر تقریر سے پہلے جناب عمران خان کا **اِيَّا كَ نَعْبُدُ وَاِيَّا كَ نَسْتَعِيْن** کے الفاظ اپنے لبرل چہرہ پر تھوڑا سا پردہ ڈالنے کی کوشش ہے۔ دلوں کے حال تو اللہ جانتا ہے لیکن ریاست مدینہ کی طرح فلاحی ریاست قائم کرنے کا نعرہ بھی کاسمیٹک نعرہ کے زمرے میں آتا ہے۔ عمران خان کے مذہبی رجحانات بھی بہت متغیر رہے ہیں۔ کبھی وہ ڈاکٹر غلام مرتضیٰ مرحوم کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ کبھی مختلف مرحلوں سے گزر کر پروفیسر رفیق احمد اختر تک پہنچے اور آخری منزل پاک پتن میں مزار پر تعظیمی سجدہ تھا۔

محترمہ بشریٰ بی بی کے روحانی اسیر بن کر وزیر اعظم بننے والے ہیں، اللہ جانے اگلی منزل کیا ہوگی لیکن ایک پیش گوئی شاید یقین کے ساتھ کی جاسکتی ہے کہ ملک میں لبرلزم اور سیکولرزم کا زور بڑھے گا۔ ہمارے موجودہ وزیر اعظم کی ساری تربیت اور شخصیت سازی برطانوی ماحول میں ہوئی ہے۔ اس وجہ سے ملک میں رول آف لا کی توقع کی جاسکتی ہے رول آف اسلام شاید خواب ہی رہے۔

سابقہ حکومت سے ایک مثبت کام ہوا کہ سکولوں میں قرآن اور ترجمۂ قرآن کی تعلیم لازمی ہوگی۔ خیبر پختون خواہ کی پی ٹی آئی کی حکومت نے بھی اپنے صوبے میں اسے نافذ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ کام اگر پورے ملک میں مؤثر طریقے سے ہوجائے تو لبرلزم اور سیکولرزم کے سامنے بند باندھا جاسکتا ہے۔ کاش جماعت اسلامی، جمعیت علماء پاکستان اور جماعت الدعوۃ سب کام چھوڑ کر اس نیک کام میں حکومت کی معاون بن جائیں تو معاشرے میں خیر کثیر کی توقع کی جاسکتی ہے۔

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

حامد کمال الدین [1]

مغربی تہذیب کا غلبہ اور امت مسلمہ کے لیے راہِ عمل

پاکستان کے جمہوری انتخابات سے اسلامی امیدیں وابستہ کرنا کم عقلی اور شرک ہے

[شرکِ ’ہیومن ازم‘ کی یلغار اور امت کا طائفہ منصورہ]

حالات کو سرسری انداز میں پڑھنا... واقعات میں ہی اٹک کر رہ جانا اور ان کے پیچھے متحرک عوامل کو نظر انداز کر جانا... خلقت کا عام شیوہ ہے۔ البتہ تعجب ہوتا ہے جب قوم کے سمجھدار بھی اشیاء کو دیکھنے اور دکھانے کے لیے ویسی ہی سطحی نظر اختیار کریں۔

بڑی ہی حیرت ہوتی رہی ہے اس لایعنی ’سنسنی‘ پر جو پاکستانی انتخابات کے حوالے سے ماحول پر چھائی رہی ہے اور بہت سوں کو ’دل تھام لینے‘ پر مجبور کر دیتی رہی ہے! ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر.. قوم کی ’قسمت جاگ اٹھنے‘ کی امید! اسلام پسندوں کے روٹھے نصیب پر ’زود پشیماں‘ ہونے کا شبہ! ’گنتی‘ کے بازار میں ’’تول‘‘ اور ’’ترازو‘‘ کی رِیت ہو جانے کی آس! شیر کو تیسری باری، بَلّا پھر کسی وقت، تیر واپس، اور فائل کلوز۔ ہاں مگر زندہ باد مردہ باد، گویا واقعتاً کچھ ہونے جا رہا ہے! وعدے، شکوے، طعنے، دکھڑے، حسرتیں جن کا کُل تعلق پیٹ اور جسم سے اور یہیں دفن ہو جانے والی دنیا سے ہے۔ ارمانوں کی انتہا کیا ہے؟ ’قوم کا اصل مسئلہ‘ اور بار بار آنے والی ’لب پہ تمنا‘ کیا ہے؟ وہی روٹی۔ بجلی۔ آٹا۔ تنخواہیں۔ وافر رزق۔ دودھ اور شہد کی بہتی نہریں، اسی دنیا میں، اِسی کفر اور اسلام سے اِعراض کی شرطوں پر اور اِسی شریعت سے منہ موڑے رکھنے کی قیمت پر..! مِمَّا تُنۢبِتُ الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوۡمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ [البقرہ ۲:۶۱] [2] بڑا ہی تعجب ہوتا رہا ہے ستر سال سے دہرائے

---

[1] داعی، دانش ور اور مصنف، ای میل admin@eeqaz.com

[2] ’زمین کی پیدا کردہ ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز (وغیرہ)‘‘ (البقرۃ:61) بنی اسرائیل کے موسیٰ علیہ السلام سے ’مطالبات کی لسٹ‘، جب وہ ان کو خدائی مشن پر لے کر چلنا چاہ رہے تھے اور جس میں سروری اور جہانبانی خود بخود آتی ہے بشرطیکہ وہ دین کی خاطر قربانیوں کا راستہ اختیار کر لیتے، مگر ان کی فکر ترکاریوں، ککڑیوں، گیہوں اور لہسن پیاز سے آگے جانے والی نہ تھی! انجامِ کار مسور تو جیسے کیسے ملے ذلت اور دربدر کی ٹھوکریں ان کا مقدر ٹھہرا دی گئیں۔ ان دربدر کی ٹھوکروں کے لیے آج ہمارے کچھ نابغاؤں کی چاہت بھی دیدنی ہے۔

جانے والے اِس منظر میں کھُبے ہوئے خردمندوں پر، جواُن خطیر واقعات کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہیں پاتے جو ایک عرصے سے افق پر دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔

دنیا سے قرآن کی حکمرانی غائب، اور دنیا کو امن اور آشتی کا گہوارہ بنا دینے کی فرحت افزا نویدیں... ایک سے ایک بڑھ کر عزم... اور ایک کے بعد ایک لیڈر!

آسمانی شرائع سے خالی اور سنسان کردی گئی دنیا کو 'ترقی وخوشحالی' کی منزلیں سر کرانے کے دجالی مژدے... اور ان کو ممکن بنانے کے لیے سرگرم دیوہیکل پراجیکٹ اور کوہ قامت این جی اوز!

کاروبارِ حیات سے ''خدا'' کی بے دخلی.. اور اس کی جگہ پر انسانی 'ترقی وکمال' کا ظہور؛ اپنے بڑے بھائی (یورپ) کے نقشے پر... 'اِس بار' اچھی خاصی ممکن شکل میں، خاص طور پر روٹی کی فراوانی کے معاملے میں...! ''روٹی'' جوکہ معاشروں میں آسمانی شرائع کو فارغ خطی دینے کا ابلیسی تدارک ہے اور دراصل خدا کی جانب سے ڈھیل اور دھکا ملنے کی ایک اندوہناک صورت، اور جو کہ یہاں پر آج تک ایک 'مستحکم حکومت' کی ضرورتمند رہی ہے؛ کیا معلوم اِس بار قوم کی قسمت جاگ اٹھے!

جس دنیا کو غربت، افلاس، بھوک اور کشت وخون سے نجات دلانے کی کوششیں اور دعوے ہورہے ہیں، بیک وقت، اُسی دنیا کو قرآنی شریعت کی عملداری سے پاک کردینے کے منصوبے پروان چڑھ رہے ہیں! بلکہ یہ دو الگ الگ منصوبے نہیں ایک ہی منصوبہ ہے: ایک ایسی دنیا کی تخلیق جس میں بھوک اور افلاس کو باقی رہنے دیا جائے گا اور نہ آسمانی حوالوں کو۔ دونوں 'پسماندگی' کا شاخسانہ ہیں جن کے خاتمے کا وقت آچکا! اور اگر ہزار کوشش اور منصوبہ بندی کے باوجود غربت، افلاس، بھوک اور کشت وخون نہ ختم کرایا جاسکے (یا اس کوشش کے دوران اور بڑھ جائے!) تو بھی 'غربت' اور 'پسماندگی' مٹانے کے شور میں ''آسمانی حوالوں'' کا خاتمہ تو بہر حال کر ڈالا جائے۔ 'بھوک' سے پاک دنیا تخلیق ہوسکے یا نہ، ''آسمانی حوالوں'' سے پاک دنیا کا وجود بہر صورت یقینی بنایا جائے۔ انسان کہیں پر بھوکا، ننگا اور مفلوک الحال ہو تو بھی خدائی کے منصب پر فائز ضرور ہو؛ مستقل بالذات، آسمان سے بے نیاز! جو اپنے فیصلے زمین پر

آپ کرے اور آسمان والے کو ایسی ہر قسم کی زحمت سے سبکدوش کر دے۔

دنیا کو آسمانی حوالوں سے پاک کرنا اصل منصوبہ ہے۔ روٹی 'پیکیج' کا حصہ ہے...پھر بھی اِس کی کوشش کی جائے گی، یقین دہانی ممکن نہیں! آخرت ہاتھ سے دینا ضروری ہے البتہ دنیا پانے کی ضمانت آپ کو کوئی نہیں دے سکتا! 'بھروسے' کے سوا چارہ نہیں خدا پر کرلیں یا ابلیس پر!

لہٰذا... سیلز مین شپ زور 'روٹی' پر رکھے گی اور سب رونے 'روٹی' کے رُلائے گی، سب دکھڑے 'روٹی' کے سنائے گی، مگر کل توجہ انسان کو ''خدا'' بنانے پر مرکوز رکھے گی؛ ایک مستقل بالذات درندہ جو پڑھ لکھ کر پہلے سے زیادہ خطرناک اور مغرور ہو گیا ہے...اور جو ''خدا'' کو اپنی دنیا سے باہر یا اگر وہ یہاں رہنے پر مصر ہی ہے تو، عبادت خانوں میں قید کر دینے کی مار پر ہے اور کچھ صدیوں کی محنت کے بعد زمین میں اچھی خاصی پیش قدمی کر آیا ہے؛ ایک گلوبل نمرود؛ ایک ملٹی نیشنل قارون؛ جس کی جکڑ میں دین، اخلاق اور اعلیٰ قدروں کا پنپنا تو خیر بھول ہی جائیں۔ معیشت، تعلیم اور صحت تک کی سانس گھٹ جاتی ہے اور جس کی گرفت میں آنے کے بعد انسان کے بنیادی ترین رشتوں کے گلے پر چھری پھر جاتی ہے؛ اور جہاں انسانیت کے لیے چیخنے چلانے تک کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ یہ چھری اس کے گلے پر ''انسان'' اور اس کے 'حقوق' کا نام پڑھ کر ہی پھیری جاتی ہے۔ یہ منصوبہ، جو درحقیقت 'ہوس اور سرمائے کی عبادت' ہے اور زمین پر انسان کے 'قیوم (self-subsisting)، خودکفیل (self-sufficient) اور خودمختار (independent) ہونے کا اعلان ہے (اور جس میں بالآخر انسان نے ہی انسان کی خوراک بننا اور بقائے اصلح (survival of the fittest) والے اُس قدیمی جنگل کے قانون نے ہی جیت کر دکھانا ہوتا ہے، لہٰذا کمزوروں کے حصے میں یہاں کراہنے اور مرگِ مفاجات پانے کے سوا کچھ نہیں آتا، اور جو ایک ایسی حقیقت ہے جو ایک اندھے کو بھی نظر آسکتی ہے)...اِس 'ہوس پرست انسان' (سرمایہ دار درندے) کو آزاد کرنے کا یہ منصوبہ جو 'انسانیت' (humanism) کے نام پر چلایا گیا، اب حیرت انگیز رفتار کے ساتھ پاکستانی معاشرے میں چوکڑیاں بھرنے لگا ہے۔ سب راستے اب اسی 'روم' کو جاتے ہیں؛ خواہ کسی شیر کی راہ سے جائیں یا اس کے لیے کسی چیتے یا بھیڑیے کا دامن تھام لیں یا کسی عمامہ بردار کے پیروکار ہو جائیں۔ سب اسی کی خدمت پر مامور...یا 'موقع' کے متلاشی۔

کون ہے یہاں جو اس نظام سے کفر کرتا ہو؟ جو محض نظریاتی حد تک ہی انسانی خدائی کے اِس عالمی دجالی انتظام کے ساتھ برسرِ جنگ ہو؟ جبکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ عالمی ساہوکاری نظام ہر ہر ملک میں دستیاب ’گنجائش‘ کو بہترین انداز میں کام میں لاتے ہوئے، وہاں کے لیے ایک مقامی روپ دھارتا ہے[1] اور پھر اپنے ’’مکمل ظہور‘‘ کے لیے وہاں پر مسلسل جگہ بناتا چلا جاتا ہے۔ جیسے جیسے وہ اپنے اِس عمل میں پیش قدمی کرتا ہے ویسے ویسے آپ اُس کے آگے پسپائی اختیار کرتے اور اپنی اکثر اشیاء سے دستبردار ہوتے چلے جاتے ہیں، کم از کم بھی یہ کہ اپنی ان اشیاء کو اُسی کے پیراڈائم میں رکھ کر دیکھنے دکھانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے وجود تک کو اسی کے تناظر میں اور اُسی کے دیے ہوئے حوالوں سے پڑھنے اور پڑھانے لگتے ہیں... اور آخر اُسی کے گرداب میں گم ہو جاتے ہیں۔

بے شمار قومیں اب تک اس عفریت کی خوراک بن چکی ہیں البتہ ایک بھاری بھرکم نوالہ جو اس کے حلق میں پھنس چکا ہے اور جو اس سے نگلا جا رہا ہے اور نہ وہ اسے اگلنے کے لیے تیار ہے، اور جس کا نام ’’عالمِ اسلام‘‘ ہے، اور جو اپنے کچھ ’سرپھروں‘ کے دم سے اس عفریت کی باچھیں چیرنے اور اس کے حلق میں ڈائنامائٹ کے چھوٹے چھوٹے نشتر لگانے کا سبب بن رہا ہے... اس کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہاں کے سیانے یہ نشاندہی کرنے لگے کہ اس عفریت کی موت شاید اِسی ’’عالم اسلام‘‘ والے لقمے کو نگلنے کی کوشش کے دوران ہونے والی ہے جس پر اُس کی رال تو بہت بہی ہے اور جس میں لذت کا سامان بھی اُس کے لیے بے حد زیادہ ہے یہاں تک کہ اِس کو ہڑپ کرنے میں اُسے مدد دینے والے نام نہاد اسلامی دانشوروں کی اِک فوج ظفر موج پائی جاتی ہے... پھر بھی اِس اشتہا انگیز لقمے کے اندر کچھ ایسے

---

[1] جبکہ اپنے عالمی حوالے پوری طرح برقرار رکھتا ہے (یو این چارٹر وغیرہ) اور وہاں پر البتہ کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتا... اور یہاں سے وہ ایک عمومی معنیٰ میں آپ کو اپنے پیراڈائم میں پوری طرح جکڑ کر رکھتا ہے۔ چنانچہ اپنے عالمی حوالوں اور اصطلاحوں سے مدد لے کر ہی وہ دنیا میں اپنے یہ سب کرشمے انجام دیتا ہے۔

نوکیلے کانٹے رکھ دیے گئے ہیں جن کو یہاں کی قدیمی اصطلاح میں 'طائفہ منصورہ'[1] کہا جاتا ہے اور جن کے باعث اِس کو نگلنے کی کوشش اُس کے گلے کی پھانس بن گئی ہے یہاں تک کہ اُس کی اجل کا سامان بنتی نظر آ رہی ہے۔

حضرات! اصل غلامی اور فی الحقیقت 'ہڑپ ہونا' عسکری طور پر مفتوح ہونا نہیں، کیونکہ ایسے ادوار تو آزاد اقوام پر آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ اصل غلامی اور نیستی و نابودی یہ ہے کہ آپ کے قلوب اور اذہان ہی اُس کے فکری پیراڈائم کی بیڑیاں پہن لیں اور ان فکری بیڑیوں کو اپنے وجود کے حق میں زینت باور کرنے لگیں۔ ہاں یہ چیز موت سے بدتر ہے؛ کیونکہ عسکری میدان میں موت پانا شہادت ہے جس سے بڑھ کر شرف کی کوئی بات نہیں۔ البتہ فکری میدان میں موت پانا بدترین ہلاکت، جس پر آسمان روتا ہے اور نہ زمین افسوس کرتی ہے۔

اصل زندگی.. اصل حیات.. اپنے دین کی حقیقت پر اصرار کرنا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ

[1] 'طائفہ منصورہ' کا ذکر متعدد احادیث میں آتا ہے۔ عقیدہ کی کتب بھی اس کے ذکر سے پُر ہیں۔ ہمارے دین میں اس طائفہ کے قائم و دائم رہنے کی باقاعدہ پیشین گوئی ہوئی ہے۔ مختصراً: یہ امت محمد ﷺ کا وہ خاص طبقہ ہے جو ہر دور میں باطل سے ہاتھا پائی کرے گا اور کبھی سرنڈر نہیں ہوگا۔ اس کے دو خصوصی محور ہیں: ایک وہ ٹھیٹھ اصحاب علم و دانش جو باطل کے فکری قلعے مسمار کرتے رہیں گے، اور دوسرے وہ مجاہدین جو بزور شمشیر باطل کے دانت کھٹے کرتے رہیں گے۔ اس طائفہ کو ''منصورہ'' اس لیے کہا گیا کہ اسے آسمان کی پشت پناہی حاصل رہے گی؛ نہ مخالفین کبھی اس کا بال بیکا کر سکیں گے اور نہ وہ گھر کے لوگ جو دشمن کے مقابلے پر اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے یا جو اِس جنگ میں دشمن کے طرف دار ہو جائیں گے۔ ہم اپنے الفاظ میں کہیں تو طائفہ منصورہ: اِس امت کے جسم میں فِٹ کر دیا گیا وہ خودکار نظام ہے جو باطل کے مقابلے پر اِس کی نظریاتی مدافعت اور اِس کی عسکری مزاحمت کو میدان میں لاتا رہے گا اور جو، ازروئے احادیث، اِس امت کے جسد میں قیامت تک معطل نہ ہوگا اور درحقیقت اس کو زندہ اور باقی رکھنے کا باعث ہوگا۔ حضرات! امتِ محمد ﷺ کا قیامت تک اپنی اصل پر قائم و دائم رہنا کوئی معمولی بات نہیں؛ اس حقیقت کا اصل راز اور روحِ رواں یہی برگزیدہ طبقہ (طائفہ منصورہ) ہے جو اِس امت اور اِس کے عقیدہ کی خاطر باہر والوں کی بے تحاشا دشمنی بھی مول لے گا اور اندر والوں کی مسلسل جفا کاریوں کی بھی زد پر رہے گا، البتہ اس کی نظر خدا کے اجر پر رہے گی اور خدا کی مدد اس کی پشت پر۔ اِن احادیث کا عملاً متحقق ہونا خود آج ہمارے دور میں بھی ہر شخص دیکھ سکتا ہے اور اِن نبوی پیشین گوئیوں کا بالفعل پورا ہونا خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر سکتا ہے، والحمدُ لله الذي بعثَ محمداً بالحق وجعل رايتهٔ قائمةً إلى قيام الساعة.

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوۡلُ بَيۡنَ الۡمَرۡءِ وَقَلۡبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ [الانفال ۸: ۲۴]

''اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجا لاؤ جب کہ رسول تمہیں ایک حیات آفرین چیز کی جانب بلاتے ہیں۔ اور جان رکھو کہ اللہ آدمی کے اور اس کے قلب کے مابین حائل ہو جایا کرتا ہے، اور یہ کہ تم سب کو اللہ ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔''

اِس حیات سے ہی اصل اِحیاء ہے؛ اور اس سے دستبرداری اصل موت۔ آدمی حیران رہ جاتا ہے یہاں احیائے اسلام کی اُس جدوجہد پر جو پچھلی نصف صدی سے جاری ہے... ہمارا یہ احیائی عمل اپنے سب اسلامی حوالے یہاں کی نیشن سٹیٹس (قومی ریاستوں) کے حوالوں کے اندر فِٹ کر کر کے خوش ہوتا رہا... جبکہ ہماری یہ نیشن سٹیٹس اپنے سب حوالے اس عالمی ساہوکاری نظام کے حوالوں کے اندر فِٹ کر کر کے مطمئن ہوتی رہیں! (ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں)۔ نتیجہ یہ کہ آج آپ ('آپ' سے مراد اب قومی ریاستیں نہیں؛ وہ کہانی اب بہت پرانی ہو چکی، بلکہ خود اسلامی تحریکیں) نہ چاہتے ہوئے بھی اِس عالمی ساہوکاری عمل کا حصہ ہیں؛ آپ کی تمام تر گردش آج اسی کے فلک میں ہے؛ اور اسی کو موٹا تازہ کرنے کا ذریعہ۔ آپ نیشن سٹیٹ کی ملت میں گم، اور آپکی نیشن سٹیٹ اِس عالمی ملت میں گم!

یہاں آپ پر کھلتا ہے کہ ایک 'نظریاتی بغاوت' اِس جہانِ نو کے اندر کس قدر ناگزیر تھی؛ اور 'زندگی' پانے کے لیے آپ کی اور آپ کے دم سے پوری انسانیت کی کتنی بڑی ضرورت۔ یہاں آپ پر عیاں ہوتا ہے... کس شدت کے ساتھ یہ 'دور اپنے براہیم کی تلاش میں' تھا!

'توحید' درحقیقت آج کے اِس عالمی ساہوکاری دین سے کھلی بغاوت کر دینے کا نام ہے؛ وہ عالمی ساہوکاری دین جس کا ایک بھی حوالہ اختیار کرنا مسلمان کے حق میں موت تھا، مگر اس کے یہ مستعار حوالے ہمارے یہاں دھڑا دھڑ 'اسلامیائے' گئے اور اس کارگزاری (achievement) پر خوب خوب داد سمیٹی گئی، آخر ایک دن اپنی یہ فاقہ مستی رنگ لائی؛ ہمارا سب کچھ نیلام میں گیا اور ہم ایک لایعنی وجود کی طرح اس کی ڈیکور کا ناقابل ذکر حصہ ہو گئے اور اس نقطے پر پہنچے جسے بہت دیر پہلے کسی خردمند نے 'نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم' سے تعبیر کیا تھا۔

'عقیدہ' دراصل ہم جس چیز کو کہتے ہیں موجودہ ملکی و عالمی تناظر میں وہ اس عالمی شرک کے مقابلے پر ایک 'کھلے انکار' کا نام ہے۔ وہی کھلی دوٹوک 'لا' جس سے ہمارا کلمۂ توحید شروع ہوتا

ہے۔ یہ عالمی شرک، جسے انسان پرستی یا انسانی خدائی (Humanism) کا نام دیا جاتا ہے اور جو کہ اپنا ظہور ڈیموکریسی، سیکولرزم، سرمایہ داری، آزادی، مساوات، فیمن ازم، اخلاقی قدروں کے قتل، رائے عامہ، عریانی، انارکی اور فری مارکیٹ اکانومی وغیرہ کے پورے ایک پیکیج کے ذریعے کرتا ہے، اور اس کی ایک چیز لے لینے کے بعد جلد یا بدیر آپ کو اس کی باقی چیزیں بھی لینا ہوتی ہیں؛ بلکہ اس کی ایک چیز اس کی دوسری چیز کی جگہ بنانے کے لیے ہی ہوتی ہے (’پک اینڈ چوز کی آزادی‘ سے بڑا فریب اور اس سے بڑی سیلز مین شپ یہاں کوئی نہ ہوگی؛ جس پر حالات مسلسل گواہی دے رہے ہیں، یہاں تک کہ دل کے اندھوں بہروں کو چھوڑ کر اب یہ ہر کسی کو دکھائی اور سنائی دینے لگی ہے)... اِس عالمی دین کے آگے آپ کو ایک **مکمل اِباء** (an absolute defiance) اختیار کرنا تھی① اور اِس کو مسترد کر کے اللہ واحد قہار کی خدائی اور کبریائی کا اعلان اور اس کی عبادت اور بندگی کا اقرار اور تمام جہانی معاملات کو ایک اُسی کی شریعت کی جانب لوٹانا اور اُسی کی جانب تحاکم کا دستور اختیار کرنا اور خاص اِس بنیاد پر ملتِ شرک کے ساتھ ایک نہ ختم ہونے والا نزاع سامنے لے کر آنا تھا۔ اسی چیز کو ہم اپنی اصطلاح میں ’’عقیدہ‘‘ کہتے ہیں (اور اسی وجہ سے ’’عقیدہ‘‘ پر اتنا زور دیتے ہیں) کیونکہ اِس سارے عمل کی روحِ رواں بس یہی ہے کہ ’’جاہلیت کے ساتھ مخاصمت‘‘ اور ’’غیر اللہ کی عبادت سے بیزاری و برأت‘‘ ہمارے فکری وجود سے پھوٹ پھوٹ کر برآمد ہو رہی ہو۔

① ’’مکمل اِباء‘‘... اِس مسلکِ حق کے حامل لوگ آگے چل کر منہجی طور پر دو سکولز آف تھاٹ میں منقسم ہوتے ہیں:

۱۔ ایک وہ فریق جو مسلم سرزمینوں میں جاہلیت کے زیر سایہ چلنے والے سب یا بیشتر اداروں سے نکل آنے اور عملاً گوشۂ عزلت (isolation) میں محصور ہو رہنے کو اپنے اس منہج کا حصہ ٹھہراتا ہے۔ یہ فریق معاشرے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے یا تو تہی ہوتا ہے یا وقت گزرنے کے ساتھ تہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے کچھ افراد جو معاشرے اور زندگی کی تشکیل و انتظام کرنے والے اداروں کو چھوڑ کر اس کی دعوت میں شامل ہوئے ہوتے ہیں اپنی سابقہ اہلیت کے دم سے معاشرے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے ضرور کچھ نہ کچھ لیس ہوتے ہیں مگر خود ان کی اگلی نسل جو معاشرتی عمل سے دور رہ کر جوان ہوئی ہوتی ہے نیز ان کی عمومی بھرتی اِس صلاحیت سے عاری اور اس کی اہمیت سے ناواقف ہوتی ہے، جبکہ اپنے اختیار کردہ عمومی منہج کے باعث یہ طبقے مجموعی طور پر سماجی تاثیر کی صلاحیت اور پوزیشن سے ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ ’’عقیدہ‘‘ اور ’’پیراڈائم‘‘ کے معاملہ میں حق پر ہونے کے باوجود یہ لوگ معاشرے میں

کوئی ایکویشن (equation) نہیں بنا پاتے اور سماجی طور پر غیر موثر و غیر متعلقہ رہتے ہیں، سوائے یہ کہ کسی محدود سے علاقے میں کسی آبائی یا قبائلی بنیاد پر ان کو عام آبادی یا اس کے معتد بہ حصے کی وابستگی اور پیروکاری حاصل ہو۔ ایسی استثنائی صورت میں، خود ہماری نظر میں، اسلامی دعوت کو جاہلی اداروں سے دوری اختیار کرنے اور کروانے کا ہی منہج اختیار کرنا چاہیے اور خود اپنی راہنمائی اور نگرانی میں وہاں پر لوگوں کو زندگی کے زیادہ سے زیادہ شعبوں کے اندر ماڈل منصوبے بنا کر دینے چاہئیں اور اِس طریقے سے حتی الامکان وہاں جاہلی بینکوں، سکولوں، درسی نصابوں، ٹی وی چینلوں و دیگر کمیونی کیشن اداروں، انشورنس کمپنیوں، سیکولر این جی اوز اور سیاسی و سماجی اداروں وغیرہ کے قدم لگنے میں آڑے آنا چاہیے اور ایسے سب کام شرعی بنیادوں پر خود کر کے دینے چاہئیں۔ بلکہ کچھ محنت کے بعد اگر وہاں پر کسی اسلامی قوت کے قدم جم جائیں، چاہے اُسکو وہاں پر حکومت نہ بھی حاصل ہو صرف عوامی پزیرائی اور حمایت حاصل ہو، تو مصالح اور مفاسد کو دیکھتے ہوئے حسب استطاعت اس (a state within the state) کے عمل کو توسیع بھی دینی چاہیے۔ یہ امکان بھی رد نہ ہونا چاہیے کہ کسی بڑے اسلامی احیاء کی بنیاد شاید خدا کو یہیں سے اٹھانا منظور ہو۔ دولۃ المرابطین جس نے فاطمی (درحقیقت عبیدی رافضی) خلافت کا تین سو سالہ ملبہ ہٹا کر شمالی افریقہ کے طول و عرض میں توحید کے پرچم لہرائے اور بالآخر اندلس کو بھی ایک طرح سے از سر نو فتح کیا تھا اور یوں ملتِ صلیب کو تین صدیوں تک کے لیے (اندلس سے) پیچھے دھکیل دیا تھا، اِس عمل کی زندہ مثال ہے۔ تاہم چونکہ یہ صورت بہت محدود اور دور دراز خطوں (remote areas) کے سوا عام طور پر کہیں پیش نہیں آتی، اس لیے عمومی حوالے سے یہ منہج ہماری نگاہ میں قابل تجویز نہیں ہے۔ ہاں کچھ خاص خطوں میں جہاں ڈیموگرافی اور جغرافیائی محل وقوع واقعتاً اس کی گنجائش فراہم کرتا ہو، جیسا کہ ہم عرض کر چکے، ضرور اسی منہج کو اختیار کرنا چاہیے۔

۲۔ دوسرا فریق وہ ہے جو معاشروں میں قائم اداروں کو خالی کر آنا اور نتیجتاً گوشۂ عزلت (isolation) کا شکار ہو جانا بہر حال درست نہیں جانتا۔ معاشروں پر اثر انداز ہونے والے مراکز اور اداروں میں بدستور پایا جانا وہ سماجی عمل کا ایک حصہ جانتا ہے جو کسی وقت موقوف نہیں ہوتا اگرچہ وہ ادارے کفر کے زیر تسلط کیوں نہ آ گئے ہوں۔ یہ ان مراکز اور اداروں کے اندر باقاعدہ ایک سماجی جنگ لڑتا اور اپنی صلاحیتوں کو منواتے ہوئے وہاں پر چھاتا چلا جاتا ہے۔ یہ اُس کے فکری پیراڈائم کو مسلسل جوتے کی نوک پر رکھتا اور اس کو صاف ضلالت گردانتا ہے اور کسی ایک بھی معاملے میں اس کو اپنے لیے ''حوالہ'' نہیں ٹھہراتا، دستورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا کسی دستور اور آئین کو سرے سے نہیں مانتا (اُس کا 'داعی' بننا تو دور کی بات ہے) اور نصوصِ شریعت کے فہم یا تطبیق یا اِجراء کے مسئلہ کو علمائے شریعت کے علاوہ کسی نام نہاد 'اتھارٹی' یا 'پروسیجر' کی جانب لوٹانے کو باطل اور جاہلیت جانتا ہے۔ غرض حق کے تعین کے لیے یہ صرف اور صرف آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور ایک لچکدار سماجی و سیاسی تعامل (a flexible political and social interaction) کے باوجود دو ملتوں کا فرق نہایت نمایاں کر کے رکھتا ہے اور کسی ایک لمحہ کے لیے اسے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ البتہ سماجی، سیاسی و انتظامی اداروں کو، کفر کے زیر تسلط ہونے کے

باوجود، کفر کی جاگیر نہیں بلکہ مشترکہ انسانی زمین سمجھتا ہے جو کسی وجہ سے کفر کے زیرِ قبضہ آ گئی ہے اور جس کے ساتھ فی الحال اِسے ’ڈِیل‘ کرنا ہے۔ یہ پوری ہمت اور پامردی کے ساتھ اور اپنی سیرت و کردار، شرافتِ طبع، دیانت اور حسنِ اخلاق سے کام لے کر، نیز دانشمندی، مواقع کے درست استعمال، صراحت، قوتِ دلیل، بلاغت، جرأتِ گفتار اور سماجی مہارت کے بل بوتے پر وہاں مسلسل اپنی دسترس بڑھاتا اور زیادہ سے زیادہ ’’سپیس‘‘ حاصل کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ کچھ دیگر دستیاب امکانات کو کام میں لا کر کسی وقت پورا پانسہ ہی پلٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اِس عمل کی اعلیٰ ترین مثال یوسف علیہ السلام ہیں، جیسا کہ پچھلے شمارہ میں ہم نے امام ابن تیمیہؒ کے کلام سے اس کی نشاندہی کی تھی اور ہمارے حالیہ شمارہ میں بھی اس موضوع پر ایک مضمون شامل ہے۔ حق یہ ہے کہ عین اسی طرزِ عمل کے نتیجے میں حق کی اقامت کے حوالے سے ملکِ مصر کے حصے میں ایک نہیں دو یوسف آئے۔ ایک یوسف بن یعقوب نبی اللہ (علیہما السلام)، جنہوں نے بادشاہِ مصر کی پیش کردہ یا اُس کے سامنے اپنی فرمائش کردہ ولایت قبول کی اور بالآخر مصر کو اسلام کی قلمرو بنا ڈالا۔ دوسرا یوسف بن ایوب (صلاح الدین بن نجم الدین ایوبیؒ)، جس نے فاطمی (عبیدی فارسی رافضی) خلیفہ کی پیش کردہ وزارت قبول کی تاہم چند سالوں کے اندر فاطمی خلافت کا پتہ صاف اور اس کا خطبہ موقوف کر کے نہ صرف پورے مصر پر سنت کا علم بلند کر دیا بلکہ صدیوں کے بعد وہاں پر خلافتِ بغداد کا خطبہ بحال کروایا اور آخر شام کو مصر کے ساتھ ضم کر کے حطین کے تاریخی معرکہ میں ملتِ صلیب کی کمر توڑ ڈالی، اور اس کے نتیجے میں آئندہ آٹھ سو سال کیلئے بیت المقدس اسلامی تحویل میں واپس لے کر دیا۔ وہ خطے جو ’تہذیب‘ کا گڑھ مانے جاتے ہیں اور جہاں پر جاہلیت کا پیدا کردہ فساد معاشرے میں خاصا گہرا سرایت کر چکا ہوتا ہے اور انسانی سرگرمی کو خاصا کنٹرول حالت میں رکھا گیا ہوتا ہے، ایسے (شہری) خطے بالعموم یہ ثانی الذکر منہج اختیار کرنے کے متقاضی ہوتے ہیں۔ چونکہ بالعموم یہاں پر ہمیں ایسی ہی ایک صورتحال کا سامنا ہے، لہٰذا اس ثانی الذکر منہج پر یہاں ہم کچھ مزید روشنی ڈالیں گے:

جیسا کہ ہم نے کہا، اِس منہج کی رُو سے معاشرتی عمل کے لیے قائم اداروں کو، اگرچہ وہ کفر کے زیرِ تسلط ہوں، ایک مشترکہ انسانی سرزمین کے طور پر لیا جاتا ہے۔ ان اداروں سے مکمل ناطہ توڑ لینے کے احکام یقیناً اِس فریق کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کی مطلق تطبیق اُس وقت ہوتی ہے جب خالص اسلامی ادارے وجود میں لے آئے گئے ہوں۔ ہاں جب اسلامی ادارے وجود میں آ گئے ہوں اُس وقت جاہلی اداروں میں جانا، خاص استثناءات کو چھوڑ کر، کفر اور معصیت ہی شمار ہو گا۔ البتہ جس وقت اسلام کے قائم کردہ اور اسلام کے زیرِ ہدایت چلنے والے کوئی ادارے ہی معاشرے میں وجود نہ رکھتے ہوں تو چونکہ انسانی زندگی کو معطل بہرحال نہیں کیا جا سکتا اس لیے انسانی نشاط کے مراکز اور اداروں کو مکمل طور پر چھوڑ دینے کے احکام بھی لاگو نہیں کیے جاتے بلکہ جزوی طور پر اور خاص حدود و قیود کا پابند رہ کر کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان کو درمیانی مرحلے کے احکام کہتے ہیں اور علمائے سنت کے ہاں ان کا اعتبار کیا گیا ہے۔ (’’درمیانی مرحلہ‘‘ سے مراد وہ ادوار جب معاشرتی عمل کفر یا ظلم کے زیرِ قبضہ چلا گیا ہو، اس موضوع پر ہمارے پچھلے شمارہ کا مضمون ’’درمیانی مرحلے کے بعض احکام‘‘ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)۔

''درمیانی مرحلے کے احکام'' کے حوالے سے ہمارے علمائے شریعت فقہ اسلامی کے ڈائنامزم سے بہترین کام لیتے ہیں (تاہم معاملے کو خاصے موٹے انداز میں لینے اور فقہی باریکیوں کو نظر میں نہ رکھ پانے والے طبقوں کے لیے یہاں پر کچھ اشکالات بھی پیدا ہوتے ہیں اور وہ اِس منہج کو اُس فریق کے طرزِ عمل کے ساتھ ملا دیتے ہیں جو کفر کے پیراڈائم ہی کو اسلام کے پیراڈائم کے ساتھ خلط کرنے کا منہج اختیار کرتا ہے اور جس کے رَد پر ہمارا یہ پورا مضمون لکھا گیا ہے)۔ بہرحال یہ حق ہے کہ اس منہج کے اختیار کرنے میں اچھی خاصی فقہی گہرائی درکار رہتی ہے اور یہاں عوام الناس کو اگر ٹھیٹ توحید کے حامل اہل علم و دانش کی راہنمائی حاصل نہ ہو تو جذباتی و سطحی طبقوں کے لیے معاملہ کسی قدر 'سمجھ سے بالاتر' رہتا ہے، جیسا کہ اس وقت ہے۔ (''فقہ'' عام آدمی کا کام نہیں، فقہاء کا اختصاص ہے)۔ یہ بھی ماننا چاہئے کہ ٹھیٹ علماء کی غیر موجودگی میں معاملہ واقعتاً کسی وقت وہ جاہلی رخ بھی اختیار کر جاتا ہے جس کا رد کرنا خود ہمارے اِس مضمون کا مقصد ہے (ہدایت اور حق پر ثابت قدمی کے لیے آدمی کو مسلسل خدا رُخ رہنا ہوتا ہے؛ خدائی توفیق و استقامت سے استغناء کسی وقت ممکن نہیں؛ اور اپنے بارے میں ہمیشہ حق پر رہنے کی ضمانت نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا)۔ چونکہ اِس منہج کی عملی تطبیق فی الحال ہمارے اِس خطے میں نہیں پائی جا رہی اور لوگ اس اول الذکر منہج سے ہی مانوس ہیں (جس میں عزلت اختیار کی جاتی ہے)، اور اصل میں تو لوگوں نے وہ منہج دیکھ رکھا ہے جو جاہلیت کے ساتھ نظریاتی سطح پر ہی بیچ کی راہ چلنے کا عادی ہے... لہٰذا ہمارے تجویز کردہ (درحقیقت دورِ حاضر میں علمائے توحید کی ایک بڑی تعداد کے اختیار کردہ) اس منہج کی بابت اَذہان کے اندر اشکالات کا پایا جانا ایک طبعی امر ہے۔ ہمارے خیال میں، جب تک کوئی جماعت اس منہج کو لے کر عملاً میدان میں نہیں اترتی تب تک اس کی بابت سوالات ختم نہ ہوں گے۔

چونکہ اِس عمل میں درمیانی مرحلہ کے دوران جاہلیت کے ساتھ ایک روزمرہ تعامل بہرحال کیا جاتا ہے.. گو اس کے عملی احکام کو فقہی پراسیس سے ہی کشید کیا جاتا ہے مگر اس کی سپرٹ کو صرف اور صرف عقیدہ سے حاصل کیا جاتا ہے، یعنی اس کی کل غذا عقیدہ میں ہے... لہٰذا اِس عمل کی تہہ میں 'عقیدہ'' کی تعلیم اور تلقین کا کام اس قدر گہرا لے جانے کی ضرورت ہوتی ہے اور تعلیمِ عقیدہ و تذکیرِ ایمان کا یہ کام یہاں اس کثرت اور شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دیکھنے سننے والوں کو ''عقیدہ'' پر یہ اتنی ڈھیر ساری توجہ ایک طرح کا غلو نظر آتا ہے۔ مگر اس عمل کی ساری جان اسی چیز کے اندر ہے لہٰذا اس کی شدت میں ہرگز کوئی کمی نہیں آنے دی جاتی۔ تربیت کے لیے لگائی گئی ٹکسال کا نوجوانوں کو تیار کرنے کے عمل میں اِس پہلو پر خاص نگاہ رکھنا ہوتی ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ''عقیدہ'' کے فہم اور رسوخ میں خاص درجہ کی پختگی کے بغیر اِس کوچے کا رخ ہی نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں قدم قدم پر وہ مقامات آتے ہیں جہاں اذہان اور افکار میں جاہلیت یا اہلِ جاہلیت کی جانب میلان ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے؛ اور خطرے کی گھنٹیاں کسی وقت خاموش نہیں ہونے دی جاتیں، کیونکہ یہاں سے قدم سرک جانا اسلام کے تحریکی عمل کے حق میں صریح موت ہے۔ خود قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس جانب انتباہ کیا گیا ہے۔ (مثل سورۃ الکافرون، بنی اسرائیل 74۔75، الفرقان 52، القلم 8۔9، عبس 1۔10، الکہف 28، الانعام 121، یونس 15، ھود 112۔113 وغیرہ)۔

پاکستان اور اسلام / انتخابات ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر محمد امین

جماعت اسلامی کو نشأۃ ثانیہ کی ضرورت ہے
ایک فکری تجزیہ

جماعت اسلامی ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں بھی شکست کھا گئی۔ ممکن ہے اس پر کسی کو اچنبھا ہوا ہو، ہمیں بہر حال نہیں ہوا کیونکہ ہمیں جماعت کی شکست کا پہلے سے سو فیصد یقین تھا۔ البتہ جماعتی قیادت پر ترس ضرور آتا ہے کہ بیچارے ہر انتخاب میں کھڑے ہوتے ہیں اور ہار جاتے ہیں۔ پھر الیکشن آتا ہے تو پھر لنگر لنگوٹ کستے ہیں، زیادہ فنڈز جمع کرتے ہیں، زیادہ بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور پھر ہار جاتے ہیں۔ انہیں سمجھ نہیں آتی کہ اس کے سوا وہ کیا کریں؟ کیونکہ وہ سیاسی جمہوری انتخابی جدوجہد کو پاکستان میں اقامت دین اور اسلامی انقلاب کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں جب کہ دوسری طرف پاکستانی عوام ہیں جو جماعت کو ووٹ نہیں دیتے اور جماعت کا ووٹ بنک بڑھنے کی بجائے دن بدن گھٹ رہا ہے۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے یں جن پر غور ضروری ہے:

ایک: یہ کہ پاکستان کے عوام جماعت کو ووٹ کیوں نہیں دیتے؟ [1] اور

دوسرے: یہ کہ جماعتی قیادت کی اس Myth یا نظریے میں کتنا وزن ہے جسے وہ عقیدے کی طرح مقدس سمجھتی ہے کہ سیاسی جمہوری انتخابی جدوجہد کے سوا پاکستان میں اقامت دین اور اسلامی انقلاب کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔

ہم یہاں اپنی عقل سمجھ کے مطابق ان دونوں سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کریں گے اور اس کے لیے جماعت کے بانی مولانا مودودیؒ اور ان کے بعد کی جماعتی قیادت کے فکر و عمل اور پالیسیوں کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے اور اس کے بعد اس صورت حال کا حل پیش کریں گے، ان شاء اللہ۔

❁ مولانا مودودیؒ کی تاریخ پیدائش ۱۹۰۳ء کی ہے۔ گویا ان کی فکری اٹھان پہلی جنگ

---

[1] یہاں یہ سوال بھی بنتا ہے کہ لوگ دینی جماعتوں کو ووٹ کیوں نہیں دیتے؟ لیکن زیر بحث موضوع سے انصاف کی خاطر فی الحال ہم یہاں اس سوال سے صَرفِ نظر کرتے ہیں۔

عظیم کے بعد کے زمانے کی ہے جب مغرب اور اس کی تہذیب اپنے عروج پر تھی، خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ عالم اسلام مغربی استعمار کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور اس زمانے کے اکثر مصلحین ومفکرین کے پیش نظر یہ چیلنج تھا کہ کسی طرح مسلمان ذلت ونکبت کے گڑھے سے نکلیں اوران کی عظمتِ گم گشتہ بحال ہو جائے۔ چنانچہ مولانا نے اس کے لیے 'اقامت دین' کا نظریہ پیش کیا جس میں زیادہ زور حکومت الٰہیہ کے قیام اور اسلامی نظام زندگی پر تھا۔ پھر مولانا نے اپنے نظریے کی تائید کے لیے قرآن وسنت کی جس طرح تشریح کی اس سے بتدریج ایک نیا علم کلام وجود میں آیا۔ ۱۹۴۱ء میں مولانا نے جماعت اسلامی قائم کی اور مولانا کی فکر زیادہ منقح ہو کر سامنے آئی تو اس کے مندرجہ ذیل پہلو نمایاں ہو کر سامنے آئے:

۱۔ مغربی فکر وتہذیب کی مخالفت

۲۔ اسلامی تعلیمات کی عقلی توجیہ اور مغربی فکر وتہذیب کے مقابلے میں اس کی حقانیت وبرتری

۳۔ دستور کا کمیونسٹ طرز کا آمرانہ ڈھانچہ

۴۔ آزاد خیالی یعنی اجماع اور سلف وجمہور کی راہ سے دوری۔

روایتی علماء نے اس آخری پہلو پر اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کیا اور مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا منظور احمد نعمانی نے جلد ہی جماعت چھوڑ دی۔

❁ قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودیؒ نے دو ایسے اجتہادی فیصلے کیے جو بعد میں تجربے سے غلط ثابت ہوئے اور بہت سی خرابیوں کا باعث بنے.... اس سے مولانا کے علمی تبحر اور فکری عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق جو اجتہاد کرے اور غلطی کر جائے اس کے لیے اکہرا اجر ہے اور جو صحیح اجتہاد کرے اس کے لیے دہرا اَجر ہے۔ [1] ویسے بھی ؎

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

[1] صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۳۵۲

ایک: قیام پاکستان سے پہلے مولانا اور جماعت کا پروگرام دعوت واصلاح کا تھا اور مولانا فرد اور معاشرے کی تبدیلی سے اپنی مجوزہ اسلامی ریاست وجود میں لانا چاہتے تھے(یہ بات مولانا کی اس تقریر سے سو فیصد عیاں ہے جو انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ''اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'' کے عنوان سے کی اور جماعتی لٹریچر میں آج بھی موجود ہے)لیکن قیام پاکستان کے بعد مولانا نے 'براہ راست سیاسی جدوجہد' سے اسلامی حکومت کے قیام کا پروگرام وضع کیا کیونکہ آپ کی رائے میں تحریک پاکستان میں عوام کی اسلامی جذبات کی فراوانی اور لیگی قیادت کی پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے وعدوں کی وجہ سے اس امر کے امکانات پیدا ہو گئے تھے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست بن جائے۔مولانا نے اس موقع پر یہ بھی کہا کہ اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں کامیابی نہ ملی تو ہم اپنے دعوت واصلاح فرد ومعاشرہ کے پروگرام کی طرف لوٹ آئیں گے۔[1]

دوسرے: پہلے فیصلے کا تقاضا تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے لیے سیاسی جدوجہد کرتی لیکن یہ واضح نہ تھا کہ یہ سیاسی جدوجہد کیسی ہوگی کیونکہ قائداعظم کی رحلت کے بعد مسلم لیگی حکمران مغربی طرز کی جمہوریت ملک میں چلانا چاہتے تھے جس کے غیر اسلامی ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے جماعت اسلامی اس میں حصہ نہ لے پاتی۔اس پر مولانا نے یہ درمیانی راستہ نکالا کہ مغربی جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا چنانچہ مولانا کی رضامندی سے قرارداد مقاصد پاس کی گئی اور مولانا مودودیؒ نے پاکستانی ریاست اور سیاست کے 'مسلمان' ہونے اور اس میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔

آیئے اب دیکھیں کہ مولانا کے ان دونوں اجتہادات کا نتیجہ کیا نکلا؟

۱۔ جماعت کے اہل علم نے مولانا کے ان فیصلوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اضطراب پیدا ہوا، جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔مولانا نے ارکانِ جماعت کا اجتماع بلایا، امارت سے استعفیٰ دیا، اپنا موقف ارکان کے سامنے رکھا اور ان سے منوالیا۔نتیجتاً جماعت کے اہل علم وفضل میں سے اکثر لوگ جماعت چھوڑ گئے اور مولانا اپنی فکر کے مطابق جماعت چلاتے رہے۔

---

[1] دیکھیے ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء اور 'اسلامی ریاست' ص ۴۰۷-۴۰۲، طبع ۱۹۶۷ء، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور

مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے اہل علم کا اختلاف بنیادی طور پر چار نکات پر مبنی تھا:

ایک: یہ کہ اسلام میں بنیادی حیثیت تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کو حاصل ہے جس کی ترتیب الاقرب فالاقرب کی ہے یعنی یہ نیچے سے اوپر کو جاتی ہے یعنی پہلے دعوت وتزکیہ سے فرد کی تعمیر و اصلاح، پھر اہل وعیال واقربا کی، پھر برادری، قبیلہ، شہر اور ملک کی، جبکہ حکومت واقتدار کو ہدف بنا کر سیاسی جدوجہد سے یہ ترتیب الٹ جاتی ہے یعنی اوپر سے نیچے کو آتی ہے اور اس سے دینی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔

دوسرے: یہ کہ اس طرح جماعت دعوت واصلاح کی تحریک کی بجائے ایک سیاسی جماعت بن کر رہ جائے گی اور اس میں وہ ساری اخلاقی خرابیاں پیدا ہوجائیں گی جو آج کل کی جمہوری انتخابی سیاسی جماعتوں میں ہوتی ہیں۔

تیسرے: جماعت کا مزاج شورائی ہونا چاہیے اور اس میں شوریٰ کو بالادستی حاصل ہونی چاہیے۔ امیر جماعت کا کام شوریٰ کی طے کردہ پالیسیوں پر عمل درآمد کرنا ہو اور وہ شوریٰ کو جواب دہ ہو جب کہ مولانا مودودیؒ کا موقف یہ تھا کہ جماعت میں امیر کو بالادست ہونا چاہیے اور جماعت کو چلانے کی آخری ذمہ داری اسی کی ہونی چاہیے۔

چوتھے: دعوت واصلاح اور سیاسی جمہوری انتخابی جدوجہد کا مزاج ایک دوسرے کے خلاف ہے اور ان میں ہم آہنگی ممکن نہیں۔ دعوت وتزکیہ میں مخاطب کے فکر وعمل کی اصلاح کی جاتی ہے اور اس کے مخالفانہ ردّعمل کی پروا نہیں کی جاتی جب کہ سیاسی انتخابی جدوجہد میں آپ کو عوام سے ووٹ مانگنے ہوتے ہیں اور آپ کو ان کی خوشنودی اور حمایت درکار ہوتی ہے لہٰذا آپ نہ ان کی اصلاح کر سکتے ہیں اور نہ ان کی ناراضی مول لے سکتے ہیں۔

۲۔ بہرحال دوسرے درجے کی ساری قیادت کے مستعفی ہونے کے بعد مولانا اپنی فکر کے مطابق جماعت چلاتے رہے اور سیاسی جدوجہد میں حصہ لیتے رہے، جماعت نے لوکل، صوبائی اور مرکزی انتخابات میں بھی حصہ لیا، اکیلے بھی اور اتحاد بنا کر بھی لیا۔ جیلوں میں بھی گئے، لاٹھیاں بھی کھائیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے فیصلہ کن انتخابات آ گئے جس میں جماعت کو بہت بری طرح شکست ہوئی اور ملک بھی ٹوٹ گیا۔ مولانا اس وقت تک بوڑھے اور

بیمار ہو چکے تھے اور جماعت کی قیادت عملاً اپنے احباب کو سونپ چکے تھے۔اس وقت مولانا کو اپنی ربع صدی کی سیاسی جدوجہد کا تنقیدی جائزہ لینے کا موقعہ ملا اور آپ نے جماعت کو واپس ۱۹۴۷ء کی پوزیشن پر لے جانے کا سوچا۔آپ نے دسمبر ۱۹۷۵ء میں اس موضوع پر جماعت کی شوریٰ سے خطاب بھی کیا اور مولانا وصی مظہر ندوی حیدر آبادی کے بقول جو مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور اس دن شوریٰ میں موجود تھے،مولانا نے کہا ''میں نے بالغ رائے دہی کی وکالت کی تھی لیکن مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ میری غلطی تھی اور یہ امت کی قسمت کو جاہلوں کے حوالے کر دینا ہے۔'' [1]

مولانا نے یہ بات پبلک پلیٹ فارم پر بھی کہی ② جماعت کے پنجاب کے امیر،مرکزی رہنما اور مولانا کے پرانے ساتھی سید اسد گیلانی مرحوم نے بھی مولانا مودودیؒ کے حوالے سے اس سے ملتی جلتی باتیں بتائیں۔مولانا وصی مظہر ندوی کے نام مولانا کے بعض خطوط بھی موجود ہیں ③۔ایک معتبر رکن جماعت سے قاضی حسین احمد مرحوم نے بھی اس کا اعتراف کیا ④۔ غرض یہ بات ثابت شدہ ہے کہ مولانا مودودیؒ اپنی اس رائے پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے کہ سیاسی انتخابی جدوجہد پاکستان میں اقامت دین کی واحد راہ ہے لیکن اُس وقت کی جماعتی قیادت نے مولانا کے موقف کو تسلیم نہ کیا اور سیاسی جمہوری انتخابی جدوجہد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔اس کے بعد سے جماعت آج تک اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔

۳۔ ۱۹۷۰ء سے لے کر ۲۰۱۸ء تک یعنی نصف صدی میں جماعت نے بے شمار انتخابات میں حصہ لیا اور ہمیشہ شکست کھائی۔اس کے نتائج مندرجہ ذیل نکلے ہیں:

- جماعت اسلامی آج ایک ناکام سیاسی جماعت ہے۔اس کی سٹریٹ پاور ختم ہو چکی ہے۔اس کا ووٹ بنک معدوم ہو چکا ہے۔اس کے مرکزی قائدین کی اکثر ضمانت ضبط ہو جاتی ہے۔یہ چند سو ووٹ لیتے ہیں جبکہ ان کا مد مقابل امیدوار ایک لاکھ سے زیادہ ووٹ لے رہا ہوتا ہے۔

- جماعتی قائدین وارکان کا اخلاقی، دینی وعلمی معیار گر چکا ہے اور جو معیار مولانا

[1] ②،③،④۔ان سب کے لیے دیکھیے البرہان کا شمارہ نومبر ۲۰۱۷ء

مودودیؒ کے زمانے میں تھا اب اس کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔اور ۱۹۵۶ء میں مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے لوگوں نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ سچ ثابت ہوئے ہیں۔

۔ پاکستان میں فرد، معاشرہ اور ریاست تینوں دین سے دور ہو چکے ہیں مغربی فکر وتہذیب (خصوصاً سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم...وغیرہ) اوراس کے اصول واقدار ہر سو غالب آ چکے ہیں اور یہ بڑی حد تک نتیجہ ہے اس اجتہاد کا جو مولانا نے مغرب کی لادین سرمایہ دارانہ اور ملحدانہ جمہوریت میں چند اسلامی اصول (کاغذوں میں) داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے کر قبول کر لیا اور بدقسمتی سے دیگر علماء نے بھی اسے قبول کر لیا۔ حالانکہ یہ علمی اور شرعی طور پر بہت کمزور موقف ہے (جس کی تفصیل میں ہم یہاں نہیں جاتے۔ البرہان میں ہم البتہ اس پر کئی بار لکھ چکے ہیں۔دیکھیے مثلاً شمارہ جولائی ۲۰۱۸ء)

۔ جماعت کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کے روایتی دینی عناصر اور مدارس ومساجد کے علماء (جن کا تعلق سارے دینی مکاتب فکر سے ہے) مولانا اور جماعت کی فکر کو قبول نہیں کرتے بلکہ اسے ردّ کرتے ہیں۔عرصہ دراز تک وہ مولانا کو مسٹر مودودی کہتے اور لکھتے رہے۔انہوں نے ہر انتخاب میں جماعت کا مقابلہ کیا، اس کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کیا اور عوام کے دلوں میں جماعت کے خلاف نفرت بھر دی۔یہی وجہ ہے کہ عوام جماعت کو ووٹ نہیں دیتے۔ ہمارے علم میں ہے کہ جب خیبر پی کے میں جماعت اسلامی جمعیت علماء اسلام (ف) کے ساتھ برسر اقتدار تھی تو انہوں نے جماعت کو ایسی وزارتیں دینے سے انکار کر دیا جن میں جماعت کچھ موثر دینی کام کر سکتی تھی اور زیرزمین دونوں جماعتوں میں عدم آہنگی اور معاصرانہ چشمک جاری رہی جس کی وجہ سے ایم ایم اے اس صوبے میں کچھ بھی ڈیلیور نہ کر سکی۔انتخابات ۲۰۱۸ء میں بھی کسی دوسری مذہبی جماعت نے جماعت کو ووٹ نہیں دیے ورنہ وہ یوں بے عزت ہو کر نہ رہتی۔

حاصلِ بحث

۱۔ اگر جماعت کی قیادت سٹیٹس کو برقرار رکھتی ہے اور اپنے اس فیصلے پر مصر رہتی ہے کہ سیاسی انتخابی جدوجہد ہی پاکستان میں اقامت دین کا واحد ذریعہ ہے۔تو جس طرح وہ ماضی

میں کبھی انتخابات نہیں جیت سکی، آئندہ بھی کبھی نہیں جیت سکے گی۔ خدانخواستہ یہ نہ خواہش ہے نہ بد دعا بلکہ زمینی حقیقت ہے جو ہمیں کھلی آنکھوں نظر آرہی ہے۔ جماعتی قیادت کو اگر نظر نہیں آتی تو کیا کیا جاسکتا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(اگر کلر بلائنڈ (Colour Blind) کو دن میں روشنی نظر نہ آئے تو اس میں سورج کا کیا قصور؟)

۲۔ سیدھا سادہ حل یہ ہے کہ جماعت کے بانی، مفکر اور مصلح مولانا مودودیؒ کی نظر ثانی شدہ رائے مان لی جائے۔...لیکن معاف کیجیے گا! ہمیں جماعت کی قیادت میں اتنی علمی وفکری صلاحیت نظر نہیں آتی کہ وہ جماعت کے لیے کوئی نیا راستہ نکال سکے۔ (نہ موجودہ لوگوں میں اور نہ ممکنہ طور پر آئندہ آنے والوں میں)۔ آج تک جماعتی قیادت نے مطالبوں کے باوجود کبھی کوئی کمیٹی یا کمیشن اس غرض سے نہیں بنایا کہ جماعت کی شکست کے اسباب کا جائزہ لے اور حل تجویز کرے۔ اس دفعہ سنا ہے کہ مجلس شوری نے ایک کمیشن بنایا ہے لیکن دو باتیں جان کر ہمیں اس پر ہنسی آئی (اگرچہ بعض لوگ اس پر باقاعدہ رو رہے ہیں) ایک یہ کہ اس کمیشن کا دائرہ اختیار یہ نہیں کہ وہ جماعت کی شکست کے اسباب کا جائزہ لے، اس کے ذمہ داروں کا تعین کرے اور آئندہ کے لیے متبادل لائحہ عمل پیش کرے۔ اور دوسرے سیاسی حکمت عملی طے کرنے والی کمیٹی کے سربراہ قیم جماعت ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ میرؔ اتنے سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب، انہی حکیم صاحب سے دوا لیتے ہیں۔ اور اس کی جو کمیٹی دعوت وتربیت کے لیے سفارشات تیار کرے گی وہ پھر اسی قیادت کے حضور منظوری کے لیے پیش ہوں گی۔

بعض لوگ مطالبہ کر رہے ہیں کہ قیادت مستعفی ہوجائے (یعنی صرف امیر نہیں بلکہ نائب امراء بھی اور قیم اور اس کے نائبین بھی) اور بعض مطالبہ کر رہے ہیں کہ ارکان کا اجتماع عام بلایا جائے اور ان سے فیصلہ کروایا جائے۔ ہماری رائے میں اصل بحران فکری ہے اور قیادت کا ہے۔ جب ایسی قیادت ہی موجود نہیں جو فکری رہنمائی کر سکے تو ارکان کا جم غفیر کیا کرے گا؟ انہیں فکر دے کر کسی ایک بات پر یکسو کون کرے گا؟ ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ قیادت

کے بعض عناصر کو یا مذکورہ کمیشن کو اس کی توفیق دے تو وہ ارکان کا اجتماع عام بلائیں اور ان کے سامنے مولانا مودودی کی نظر ثانی شدہ رائے رکھ کر اسے تسلیم کر لیا جائے۔ یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح افغانستان میں طالبان اٹھے تھے، اسی طرح جماعت میں سے کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوں اور وہ باقی لوگوں کو مولانا مودودیؒ کی نظر ثانی شدہ رائے پر عمل کے لیے قائل کر لیں اور اس کے لیے تفصیلی سٹریٹجی وضع کر لیں۔ اس کے لیے یہ بھی سوچا جائے کہ مولانا مرحوم نے دسمبر ۱۹۷۵ء میں شوریٰ میں جو تقریر کی تھی، اسے شائع کر دیا جائے تا کہ ارکان وقائدین اس سے رہنمائی لے سکیں۔

خلاصہ یہ کہ جماعت اسلامی کو جو چیلنج آج درپیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ چھوٹی موٹی لیپا پوتی کر لی جائے۔ کوئی رسمی سی کمیٹی کمیشن بنا کر اس سے اِدھر اُدھر کی چھوٹی موٹی تجاویز لے لی جائیں اور داخل دفتر کر دی جائیں اور پھر کاروبار زندگی جیسا چل رہا ہے ویسا ہی چلتا رہے۔ اگر یہی ہونا ہے (اور جو کچھ نظر آ رہا ہے اس سے بہت سے لوگوں کو خدشہ ہے کہ یہی ہوگا) تو جس جماعت کو ہم آج رو رہے ہیں کہ وہ زوال پذیر ہے وہ کل کو ختم ہو جائے گی جیسے تحریک خاکسار ہمارے دیکھتے ختم ہوگئی اور آج اس پر رونے والا بھی کوئی نہیں۔ یاد رہے کہ نظریاتی جماعتوں کو حکومتیں اور ایجنسیاں ختم نہیں کر سکتیں وہ داخلی فکری تضادات کی وجہ سے ختم ہوتی ہیں۔ لہٰذا آج جماعت کو جو چیلنج درپیش ہے وہ نشأۃ ثانیہ سے کم درجے کی کوئی چیز نہیں جس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی فکر اور دستور پر نظر ثانی کی جائے۔ جماعت کی فکر اور دستور کوئی صحیفۂ آسمانی نہیں ہے جسے تبدیلی کی نیت سے چھونا گناہ ہو بلکہ یہ انسانی کاوش ہیں، اجتہادی کاوش ہیں اور ان پر نظر ثانی تقاضائے وقت ہے۔ اور یہ تو جماعت اسلامی کی خوش قسمتی ہے کہ اس کا بانی خود اس کی فکر پر نظر ثانی کر چکا لہٰذا اسے ہمہ شمہ کا منہ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اخلاص و دیانت اور راست فکری کی ضرورت ہے اور مولانا مودودی مرحوم کی نظر ثانی شدہ رائے پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ **وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.**

پاکستان اور اسلام / انتخابات ۲۰۱۸ء پروفیسر ملک محمد حسین

انتخابات اور جماعت اسلامی

بیسویں صدی کی سب سے بڑی اسلامی تحریک جس کے بانی سید ابواعلیٰ مودودیؒ اور جس کا چہرہ جماعت اسلامی ہے دنیا میں لاکھوں کروڑوں دلوں کی دھڑکن، ان کی اسلامی امنگوں کی آئینہ دار اور اُن کے دلآویز خوابوں کی تعبیر ہے۔ جماعت اسلامی کے نام سے اولو العزم مسلمانوں کی تنظیمیں لبنان سے ملائیشیا اور سری لنکا سے ہوتے ہوئے بنگلہ دیش، بھارت، مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور نہ جانے کن کن ممالک میں سرگرم عمل ہیں۔ نام بھی بہت اہم ہے لیکن کام کے لحاظ سے یوکے اسلامک مشن، اکنا، اسناط اور مشرق وسطیٰ کی اسلامی تنظیمات سید مودودیؒ، حسن البناؒ اور سید قطبؒ کے اسلامی فکری اثرات کے تحت منظم ہیں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے رات دن کوشاں ہیں۔ دعوتِ اسلامی کے ان کٹھن راستوں میں قید و بند کی صعوبتیں بھی بہت رہیں اور شہادتوں اور پھانسیوں کے مراحل بھی وافر آئے۔ حسن البناؒ شہید اور سید قطبؒ شہید سے لے کر بنگلہ دیش کے اسلامی شہیدوں تک دل گداز حکایتیں ہیں کہ دلوں کو گرماتی اور روح کو تڑپاتی چلی جاتی ہیں۔ کشمیر کے مرغزاروں اور افغانستان کے کوہساروں میں تحریک اسلامی کے نوجوانوں، سرفروشوں اور جانبازوں کا خون ہے کہ جس سے رات دن خوشبو کے جھونکے اٹھتے نظر آتے ہیں۔ تحریک اسلامی کے روح پرور ذہن رسا لٹریچر سے دنیا کی لائبریریاں بھری پڑی ہیں کہ جو اپنا کام کیسے چلا جا رہا ہے اور جدید پڑھے لکھے غیر متعصب ذہن کو اسلام کی پُرفضا وادی میں سانس لے کر اخروی کامیابی کی طرف بُلا رہا ہے۔

مَیں خود جب اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو تحریک اسلامی کے ساتھ اپنی ساٹھ سالہ رفاقت کو ہی اپنی متوقع اخروی کامیابی کی وجہ سمجھتا ہوں۔ میرا سرمایۂ فخر تحریک اسلامی ہے۔ میری شخصیت کا وقار، اگر کوئی ہے، تو تحریک اسلامی سے ہے۔ میرے قلم کی بلاغت اور زبان کی فصاحت، اگر کوئی وجود رکھتی ہے، تو اس کی وجہ تحریک اسلامی سے وابستگی ہے اور اگر دعائیں دینے والے، محبت کرنے والے، شفقت سے نوازنے والے اور سرمایۂ افتخار بننے والے دوستوں کا ساتھ حاصل ہے تو وہ بھی محض اور محض تحریک اسلامی کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ہے۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد میرا دل دکھی ہے کہ بیسویں صدی کی سب سے بڑی اسلامی تحریک کم از کم پاکستان میں عزت ووقار کی پامالی کا شکار ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کائنات کے عظیم ترین اور اللہ ربّ العزت کے پسندیدہ ترین دین کی تعلیمات پر اٹھنے والی بیسویں صدی کی عظیم تحریک کا تنظیمی چہرہ پاکستان ایسے ملک میں انتخابی بے وقاری کا شکار ہو جائے جس کی آبادی میں اٹھانوے فیصد لوگ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ماننے والے ہیں۔ اس مر پر ٹھنڈے دل سے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ ہمارا کام تو استطاعت بھر دوسروں تک دعوت پہنچانا ہے باقی اللہ کی مرضی کہ وہ کامیابی سے ہم کنار کرتا ہے یا نہیں۔ یا یہ کہہ دینا کہ ناکام ہم نہیں ہوئے، ناکام وہ ہوئے جنہوں نے ہمارے اسلامی نظام کی طرف بلانے پر ہمیں ووٹ نہیں دیے۔

کیا یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ ہم نے جو اپنے آپ کو اسلامی نظام کا سمبل سمجھتے تھے اپنا معاشرے میں امیج کیا بنایا؟ ہم نے معاشرے میں اپنا پرسپشن کیا دیا؟ ہماری صفوں میں یکجہتی کتنی تھی اور ہم نے یک سوئی کے ساتھ محنت کتنی کی؟ ہماری پالیسیوں میں اصابتِ رائے کا کتنا دخل تھا اور جماعت اسلامی کے نصب العین کو سامنے رکھ کر لائحہ عمل کیا رکھا گیا؟ سیاسی فیصلوں میں ارکان اور کارکنان کی رائے کو کتنی اہمیت دی گئی اور سیاسی فیصلوں میں تسلسل، مستقل مزاجی اور اسلامی مفاد کو کس حد تک مدنظر رکھا گیا؟ قرآن کا یہ حکم کہ ''وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو'' پر پالیسیوں میں کتنا عمل ہوا؟ اتحاد اور مخالفت کی کیفیت میں کہاں تک تسلسل اور یک سوئی رہی اور معاشرے میں نفوذ کی اثر پذیری کہاں تک رہی؟

الیکشن محض نعروں سے نہیں لڑے جاتے۔ ریلیاں، جلسے اور جلوس بھی کوئی معاونت نہیں کرتے، رات دن کی لچھے دار تقریریں بھی کام نہیں آتیں۔ کرپشن کے ٹرک کی بتی کے پیچھے بھی بگٹٹ بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر قرآن وحدیث پر عمل نہ کیا جائے تو محض دروس بھی اپنے اثرات پیدا نہیں کرتے۔ معاشرے میں گراس روٹ لیول پر عوامی جڑیں پیدا کیے بغیر محض سیاسی اتحادوں اور مذہبی بنیادوں پر مجلسیں سجانے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سوچا جانا چاہیے کہ ہمارے امیدواروں کے ووٹوں کی تعداد ہر آنے والے الیکشن میں کم ہو رہی ہے۔ اس دفعہ تو ہمارے تقریباً تمام امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ ہم نے الیکشن میں کروڑوں

اربوں روپے جھونک دیے، لاکھوں کروڑوں انسانی گھنٹے محنت میں صرف کیے، حاصل کیا ہوا بے وقاری، لوگوں کا مذاق اور اپنوں کی مایوسی۔ ہم جب الیکشن ہارتے ہیں تو صرف ہم ہی بے وقار نہیں ہوتے، ہمارے ہاتھوں ہمارا دین بھی بے وقار ہوتا ہے۔ لبرل سیکولر لابی ٹی وی چینلز پر بیٹھ کر ہمارا ٹھٹھا اڑاتی ہے اور تحریک اسلامی کا کارکن مایوسی کا شکار ہوتا ہے۔

پاکستان اسلامک فرنٹ قائم کرنے کے اقدام سے ہم نے اپنے کارکن کو بے عمل اور مایوس کرنا شروع کیا۔ ۲۰۰۲ء میں الیکشن میں متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے دینی قوتوں نے قابل ذکر انتخابی کامیابی دکھائی لیکن پرویز مشرف کی معاونت، سترویں آئینی ترمیم میں ہمارا حصہ اور خیبر پختون خواہ کی حکومت میں ہماری مایوس کن کارکردگی اور متحدہ مجلس عمل کا سرد خانے میں جا کر ۲۰۰۸ء اور ۲۰۱۳ء کے الیکشن میں انتشار کا شکار ہو جانا، ۲۰۱۳ء کے الیکشن کے بعد خیبر پختون خواہ کی پی ٹی آئی کی حکومت میں شمولیت اور اس دوران مسلم لیگ ن کی حکومت کے خلاف حد سے بڑھی ہوئی بیان بازی اور مخالفت اور ۲۰۱۸ء کے الیکشن میں متحدہ مجلس عمل کی یکایک بحالی، پی ٹی آئی کی مخالفت اور بعض جگہوں پر مسلم لیگ ن کے ساتھ موافقت.... یہ وہ امور ہیں جنہوں نے ارکان اور کارکنان کو کنفیوز کیا اور زیادہ تر لاتعلق رہنے پر مائل کیا۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم پانچ سال سوئے رہتے ہیں اور جب الیکشن کا نقارہ بجتا ہے تو ہم بھی یکایک جاگ اٹھتے ہیں اور یہ کہہ کر کہ دوسرے کیا کہیں گے کہ ہمارے پاس کھڑا کرنے کے لیے کوئی آدمی بھی نہیں ہے، کسی نہ کسی کو آگے کر دیتے ہیں۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم الیکشن ہارنے کے لیے لڑتے ہیں جیتنے کے لیے نہیں کیونکہ ہمارا مقصد تو صرف ثواب کمانا ہوتا ہے الیکشن جیتنا تھوڑی ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کارکن متحرک ہی نہیں ہوتا اور اگر متحرک ہو بھی تو چونکہ معاشرے میں ہماری جڑیں ہی نہیں لہٰذا تحرک بھی بے اثر رہتا ہے۔ معاشرے میں جڑیں پیدا کرنا ہیں تو ہمیں ڈاکٹر نذیر شہید اور پروفیسر ابراہیم (نارووال) کے رول ماڈل پر غور کرنا ہوگا۔ معاشرے میں جڑوں کو پیدا کرنا ہوگا اور سب سے پہلے بلدیاتی اداروں میں کام کرنا ہوگا۔

ہمیں اتحادوں کی سیاست سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ ابھی حالیہ انتخابات کو ہی لیں۔

ہم متحدہ مجلس عمل کا حصہ تھے۔ متحدہ مجلس عمل میں جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام ہی دو بڑی جماعتیں تھیں۔ شیعہ بھائی اور سلفی بھائیوں کے کچھ گروہوں کے ساتھ مولانا نورانی کی وراثت بھی ہم رکاب تھی۔ صورت حال یہ سامنے آئی کہ جمعیت علماء اسلام کے ذمہ داروں نے جماعت اسلامی کی کھلم کھلا مخالفت کی اور اپنے ووٹ ن لیگ کو دلوائے۔ سلفی بھائی بھی ساجد میر صاحب کی قیادت میں ن لیگ کے پیچھے صف آرا تھے۔ شیعہ بھائی تو بس شیعہ امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں یا پھر پیپلز پارٹی کو۔ لہٰذا ہم نے تو صدق دل سے اتحاد کا ساتھ دیا لیکن کسی اور مذہبی پارٹی نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ نتیجہ یہ کہ جمعیت علماء اسلام ایم ایم اے کی بارہ قومی اسمبلی کی سیٹوں میں سے گیارہ سیٹیں لے گئی اور جماعت اسلامی چترال کی صرف ایک سیٹ لے سکی، جو ویسے بھی مولانا عبدالکریم چترالی جیت سکتے تھے۔ اگر ووٹوں کی تعداد کا تجزیہ کیا جائے خصوصاً صوبہ خیبر پختوان خواہ میں، تو جمعیت علماء اسلام کے امیدواروں کے ووٹوں کی تعداد ہارنے کے باوجود بے عزت کرنے والی نہیں ہے جب کہ جماعت اسلامی کے حصہ میں چونکہ صرف اپنے ووٹ آئے اس لیے مایوس کن حد تک کم ہیں۔ بعض جگہوں پر ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ خود جماعت اسلامی کے ارکان اور بلکہ ذمہ داران نے اپنے امیدوار کو ووٹ نہیں دیے۔ چکوال کا حلقہ PP-24، NA-65 اور لاہور کا حلقہ NA-135 اس کی ناقابل تردید مثالیں ہیں۔ اسلام آباد کے حلقے NA-53 اور NA-54 نے ہمیں برہنہ ہی کر کے رکھ دیا۔ میاں اسلم جو اسلام آباد میں قومی اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں اور ۲۰۱۳ء کے الیکشن میں ۲۵۰۰۰ ووٹ لے کر ہارے، اب ۲۰۱۸ء کے الیکشن میں صرف ۶۰۰۰ اور ۷۰۰۰ ووٹ لے کر چاروں شانے چت ہو گئے۔

بیانات کی حد تک جماعت میں کوئی خفت نظر نہیں آرہی۔ الیکشن سے کافی عرصہ پہلے کے بیانات اور الیکشن کے بعد کے بیانات کا موازنہ کریں تو صورتِ حال جوں کی توں نظر آتی ہے۔ البتہ سنا ہے کہ مرکزی شوریٰ کے اجلاس کے نتیجے میں الیکشن کے معاملات پر غور وفکر کرنے کے لیے ایک انکوائری کمیشن قائم کر دیا گیا ہے۔ راقم الحروف کو کمیشن کی ترکیب کا تو پتہ نہیں ہے لیکن میری خواہش ہے کہ اس کمیشن میں ان صاحبان کو رکھا جائے جنہوں نے کبھی الیکشن نہ لڑا ہو لیکن تحریک اسلامی کی تاریخ، پس منظر اور آدرشوں سے پوری طرح واقف ہوں۔ اگر الیکشن

لڑنے والے احباب ہی اس کمیشن کے اراکین ہوئے تو ہم اس کمیشن سے کسی معروضی رپورٹ کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بدگمانی سے محفوظ رکھے لیکن انسانی کمزوریاں تو بہرحال بروئے کار آتی ہیں۔

جماعت اسلامی نے الیکشن کے حوالے سے جو تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا ہے اس کی خدمت میں چند سوالات رکھے جاتے ہیں تاکہ ان کے جوابات کی روشنی میں وہ دیگر پہلوؤں کے علاوہ وہ ان کے حوالے سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کرے:

ا۔ اس وقت جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ الیکشن کے حوالے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اضلاع میں ضلعی نظم کے علاوہ شہری اور قصباتی نظم، قومی اور صوبائی حلقوں کے حوالے سے زونل نظم قائم ہیں۔ لاہور کی اگر مثال لی جائے تو ضلعی نظم کے علاوہ لاہور کو چار علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان حلقوں کے نیچے زون ہیں اور لاہور میں قومی اور صوبائی حلقوں کے لحاظ سے ۳۰ زون بنائے گئے ہیں۔ ہر علاقے کا ایک امیر ہے اور پھر ہر زون کا ایک امیر ہے۔ زونل امراء یا ناظمین کو ٹرانسپورٹ اور آمدورفت کے عمدہ وسائل دیے گئے ہیں۔ ایک اندازہ ہے کہ اس بھاری بھرکم تنظیمی ڈھانچے پر ہر سال لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہوں گے اور بہترین مین پاور اس میں لگائی گئی ہوگی۔ کمیشن اس بات کا جائزہ لے کہ اس تنظیمی ڈھانچے کی کارکردگی کیا ہے؟ یہی نا کہ محترم امیر العظیم نے اس حلقے سے جس میں منصورہ اور ملحقہ علاقے شامل ہیں صرف ۱۰۹۳ ووٹ لیے۔ جماعت کے سیکرٹری جنرل نے جو اپنے حلقے سے پہلے تین بار منتخب ہو چکے ہیں، الیکشن ۲۰۱۸ء میں ۵۱۷۰ ووٹ لیے جبکہ الیکشن ۲۰۱۳ء میں ساڑھے تین ہزار ووٹ لیے تھے۔ حافظ سلمان بٹ جیسے ڈیشنگ لیڈر نے ۱۵۸۴ ووٹ لیے جب کہ پچھلی دفعہ ۹۶۰ ووٹ لیے تھے۔ لاہور جہاں جماعت کا مرکزی دفتر ہے اور زون کی حد تک شاندار تنظیمی ڈھانچہ ہے وہاں اتنی مایوس کن کارکردگی؟ کراچی، پشاور، اسلام آباد، ملتان، سکھر وغیرہ میں بھی اسی طرح کے تنظیمی انتظامات ہوں گے۔ میرے چھوٹے سے ضلع خوشاب میں بھی قومی اور صوبائی حلقوں کے ناظمین ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ضلعی نظم ہو یا شہری نظم اور زونل نظم سب دو ہی کام کرتے ہیں: ایک اجتماعِ ارکان اور دوسرا کبھی کبھی درسِ قرآن۔ اس کے علاوہ کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آتی۔

۲۔ دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ارکان اور کارکنان کا مورال بہت پست ہو چکا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ پالیسیاں ہیں جن میں کوئی تسلسل نہیں۔ پست مورال کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ ہر ضلع میں دیر سے لے کر کراچی تک، ارکان بھی اور ذمہ داران بھی گروہ بندی (اختلاف رائے نہیں) کا شکار ہیں۔ اختلاف رائے کی میں اس لیے نفی کر رہا ہوں کہ دیانتداری پر مبنی اختلاف رائے تو رحمت ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں گروہ بندی نہیں ہوتی۔ تربیت اور مثبت سرگرمیوں کے ذریعے سے گروہ بندی کے مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ انکوائری کمیشن کا کام یہ ہوگا کہ وہ ارکان وکارکنان کی مایوسی اور گروہ بندی کا جائزہ لے اور جماعت کی انتخابی کارکردگی پر اس کے اثرات کا اندازہ لگائے۔

۳۔ کچھ مخلص لوگوں کی رائے ہے کہ نظم اور کارکنان میں باہمی رابطہ ختم ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں نظم کے فیصلے عوامی احساسات کے آئینہ دار نہیں ہوتے اور عوام کے دلوں میں نظم کے متعلق بُرے وسوسے جنم لیتے ہیں۔ جماعت کے رینکس اینڈ فائل (Ranks and file) میں (Trust deficit) یعنی اعتماد کی کمی جنم لے چکی ہے۔ گھٹن ہے کھلا پن نہیں ہے۔ ظاہر ہے ایک نظریاتی دینی جماعت کے لیے یہ صورتِ حال پسندیدہ نہیں ہے۔ انکوائری کمیشن کو اس کا بھی دقت نظر سے جائزہ لینا ہوگا۔

۴۔ مبینہ طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ انتخابات کا دھندا بعض ذمہ داران کا کاروبار ہے جس سے ہار جیت سے ماورا انہیں بہر حال فائدہ ہی ہوتا ہے۔ یہ بدگمانی خاکم بدہن بہت تباہ کن ہے۔ کمیشن اس بدگمانی پر بھی کھلے دل سے غور کرے۔

۵۔ جماعت اسلامی سے منسلک لوگوں کے تعلیمی ادارے اور ان کے وسیع نیٹ ورک جماعت کے نظریاتی کام اور خصوصاً انتخابات میں ممد ومعاون ہونے چاہئیں لیکن بدقسمتی سے الٹا کام ہو رہا ہے۔ لوگ جماعت کے لوگوں کے تعلیمی اداروں میں اپنے بچوں کو پڑھاتے تو ہیں لیکن یہ تجارتی تعلیمی ادارے ہونے کی وجہ سے جماعت کا کوئی اچھا اور مثبت امیج نہیں دیتے نتیجتاً انتخابی نقصان کا باعث بن رہے ہیں۔ کمیشن اس امر کا بھی جائزہ لے۔

۶۔ دیر کے ایک انتہائی بزرگ رکن، مربی اور ضلعی ذمہ دار کے بقول جماعت کے

بعض سینئر ذمہ داروں کو الیکشن فوبیا ہوگیا ہے۔ اس فوبیا کی وجہ سے انہیں معروضی حقائق نظر نہیں آتے۔ عوام میں تو کوئی کام ہوتا نہیں لیکن ہم ووٹ لینے بھاگ پڑتے ہیں۔ یہ کہ ’’عوام میں کوئی کام ہوتا نہیں‘‘ اس پر بھی نظر ڈالنی چاہیے کیونکہ اگر الیکشن میں حصہ لینا ہے تو عوام میں کام تو ہونا چاہیے۔

۷۔ قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ ہمارے پاس الیکشن میں کھڑا کرنے کے لیے کوئی ڈھنگ کا آدمی تو ہوتا نہیں لیکن جن کو انتخابی ٹکٹ دیا جاتا ہے وہ زیادہ تر اسلامی جمعیت طلبہ کے سابقہ قائدین ہوتے ہیں۔ اب ہمارے ان بھائیوں کی پوری تربیت اور شخصی اٹھان سٹوڈنٹس میں اٹھنے بیٹھنے اور تعلیمی اداروں کے ذمہ داران کے خلاف احتجاجی تحریکیں چلانے پر مبنی ہوتی ہے۔ طلبہ سیاست میں بے پناہ مصروفیات کے باعث تعلیم و تعلم اور مطالعہ ومشاہدہ سے زیادہ تر کنارہ کشی ہی رہتی ہے اس لیے عوامی رجحانات، انتخابات کی سائنس اور قومی ایشوز پر گہرائی سے کوئی ذہن نہیں بنا ہوتا اس لیے انتخابی کارکردگی مایوس کن رہتی ہے۔ امیدواروں کے انتخاب کے حوالے سے بھی انکوائری کمیشن کو تحقیق کرنی چاہیے کہ کیا یہ سارا کام رواروی میں ہوتا ہے یا اس کے پیچھے کوئی تحقیق اور ذہن بھی کارفرما ہوتا ہے۔

۸۔ کمیشن کو اس بارے میں بھی غور کرنا چاہیے کہ ہم کیوں اپنی عزت اور وقار کے سمبلز یعنی مرکزی نظم کے اعلیٰ ذمہ داران کو الیکشن میں جھونک دیتے ہیں اور پھر زخم کھا کر اگلے پانچ سال ان زخموں کو سہلاتے گزار دیتے ہیں؟ اس پر غور ہونا چاہیے کہ مرکزی اور صوبائی ذمہ داران کو کسی صورت انتخابات میں نہ اُتارا جائے۔

۹۔ آخر میں خواہش کی شکل میں ایک تجویز کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ کاش جماعت اسلامی کم از کم اگلے دس سال تک قومی اور صوبائی سطح کے الیکشن سے احتراز کر کے فرد کی تربیت اور تنظیمی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کی طرف توجہ دے اور بلدیاتی انتخابات میں تیاری کے ساتھ بعض منتخب ضلعوں اور شہروں میں حصہ لے اور کامیابی کی صورت میں کارکردگی دکھائے تو معاشرے میں نفوذ کے راستے نکل سکتے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تحریک انصاف کی حکومت جلد از جلد بلدیاتی انتخابات کرانے کی کوشش کرے گی۔ خصوصاً صوبہ پنجاب میں تو یہ بات یقینی

ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ جماعت اسلامی ابھی سے منتخب شہروں اور دیہاتی حلقوں میں کچھ اہل افراد کا انتخاب کر کے ان کی پروجیکشن شروع کر دے۔ عوامی مسائل از قسم صاف پانی، بیروزگاری، ماحول کی آلودگی، نکاسیٔ آب، مساجد کی خدمت اور بے کس اور بے بس لوگوں کی اعانت کے ساتھ مقامی بلدیاتی دفاتر میں عوامی کے مسائل اور کاموں کے حوالے سے معاونت شروع کر دے تو بلدیاتی انتخابات میں کامیابی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

پس نوشت

پتہ چلا ہے کہ مرکزی مجلس شوریٰ نے سیاسی حکمت عملی وضع کرنے کے لیے جو کمیشن قائم کیا ہے اس میں محترم لیاقت بلوچ صاحب، محترم لقمان قاضی صاحب اور محترم راشد نسیم صاحب شامل ہیں۔ ان تینوں قائدینِ جماعت کے اخلاص، صلاحیت، تدبر اور قوتِ عمل سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ہم نے جیسا کہ پچھلی سطور میں تجویز پیش کی کہ اس طرح کے کمیشن میں اگر ایسے اصحاب شامل کیے جاتے جنہوں نے کبھی الیکشن نہیں لڑا لیکن جماعتی شعور اور تاریخی پس منظر سے ان کی کماحقہ واقفیت اعلیٰ درجے کی ہوتی اور ساتھ ہی اگر بیرونی حلقہ احباب سے بھی کچھ صاحب علم لوگ لے لیے جاتے تو مذکورہ کمیشن کے نتائج فکر کا اعتبار بڑھ جاتا۔ اسی طرح دعوت و تربیت اور تنظیم کے لیے جو کمیٹی قائم کی گئی ہے اس میں محترم شاہد ہاشمی جیسے ایک دو اور احباب کا اضافہ ہوتا تو وسعت فکر کا اہتمام بھی ہو جاتا اور مستقبل کی نقشہ گری بھی شاید بہتر سامنے آتی۔ محترم شاہد ہاشمی صاحب ادارہ معارف اسلامی کراچی کے زیر اہتمام پندرہ روزہ معارف فیچر شائع کرتے ہیں جس میں دنیا بھر سے مفید مضامین کا انتخاب شائع ہوتا ہے۔ یہ غالباً اس ملک میں ہونے والا سب سے وقیع علمی کام ہے جو جناب ہاشمی صاحب کر رہے ہیں کچھ ماہ پہلے میں نے انہیں برقی خط کے ذریعے تجویز کی شکل میں یہ خواہش بھیجی تھی کہ کاش ہمارے مرکزی اور صوبائی قائدین معارف فیچر کو پڑھیں اور اس پر ہر ماہ سٹڈی سرکل بھی کریں۔ میری اس تجویز کو بہادل نگر کے ایک رکن نے کہیں پڑھ لیا اور جھٹ مجھے فون کیا کہ آپ ایسی بے معنی تجویزیں کیوں دیتے ہیں جب کہ آپ کو پتا ہے کہ ہمارے قائدین کے پاس اس قسم کے فضول علمی کاموں کے لیے وقت نہیں ہے۔

جماعت اسلامی اور جمہوریت کا سراب

دھاندلی کا شور محض پروپیگنڈا ہے

پاکستان دشمنی میں اگر سازشی کہانیاں گھڑنے کا مقابلہ کیا جائے تو پاکستان کے میڈیا پر چھائے سیکولر، لبرل اور بھارت پرست دانشور، تجزیہ نگار اور اینکر پرسن جیت جائیں۔ چند گھنٹے نتائج کے التواء نے ان سب کی صلاحیتوں کو جلا بخش دی۔ ایسے ایسے نکتے نکالے گئے کہ شرلاک ہومز اور آگاتھا کرسٹی کی تحریریں بھی شرما جائیں۔ پورے پاکستان کے چینل اور ان پر بیٹھے ہوئے صحافی جب یہ درفنطنیاں چھوڑ رہے تھے، تو دوسری جانب عمران کی جیت سے خائف بھارتی میڈیا اسے ''کشمیر خان'' اور ''طالبان خان'' کے لقب سے پکار رہا تھا۔ تجزیوں کا کمال دیکھیں کہ جس ملک کے تقریباً پچاس شہروں میں ٹی وی چینلوں کی ڈی ایس این جی گاڑیاں کیمروں کے ساتھ موجود ہوں، وہ مسلسل کئی گھنٹے یہ خبر سناتے رہے کہ پولنگ ایجنٹوں کو زبردستی پولنگ اسٹیشنوں سے باہر نکال دیا گیا اور بیس کے قریب بڑے نیوز چینلوں میں سے کسی ایک نے بھی کسی ایک ایسے پولنگ ایجنٹ کا انٹرویو نشر نہیں کیا جسے باہر نکالا گیا تھا۔ یہ پولنگ ایجنٹ ایک سیاسی ورکر ہوتا ہے، اسے میڈیا کے سامنے آکر بات کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی، لیکن یہ ایسے ''شرمیلے کارکن'' تھے کہ رات بھر میڈیا کے سامنے نہ آسکے مگر ہمارے زیرک تجزیہ نگار سیاسی پارٹیوں کے بیانات پر ایک کہانی بناتے رہے، ایک نہیں بلکہ کئی کہانیاں۔ کچھ کہتے دراصل عمران خان کو واضح جیت دلانا مقصود ہے، اس لیے ان دس پندرہ سیٹوں پر جہاں وہ جیت نہیں رہا ہے وہاں رزلٹ تبدیل ہو رہا ہے۔ اگر ایسا کرنا تھا تو ۲۷۰ حلقوں کا رزلٹ روکنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ پھر کہا گیا رزلٹ روک لیے گئے اور فوج ٹھپے لگا رہی ہے۔ یہ سب کچھ ٹیلی ویژن چینلوں پر بیٹھے تجزیہ نگار اور رپورٹر بتائے جا رہے تھے لیکن کوئی نوے ہزار پولنگ سٹیشنوں میں سے کسی ایک کے باہر اپنا کیمرہ لے کر نہ پہنچا کہ یہ دیکھو! یہاں یہ لوگ بند ہیں، باہر فوج کا پہرا ہے اور اندر ٹھپے لگائے جا رہے ہیں۔

بدترین تبصرہ یہ تھا کہ دیکھو اس ملک میں اب انارکی پھیلے گی۔ لوگ فوجیوں کے ساتھ دست وگریباں ہو جائیں گے۔ پھر اس کے بعد ملک اور اس کا مستقبل خطرے میں آجائے گا۔

لیکن رات دس بجے سے پہلے یہ سب تجزیہ نگار ایک اور طرح کی کہانی بیان کر رہے تھے کہ دیکھیں پورا رزلٹ آنے کا انتظار کریں۔ کیسے ہوسکتا ہے کہ نواز شریف اور مریم نواز کا ہمدردی کا ووٹ نون لیگ کو نہ ملے۔ اگر ہمدردی ہی پیمانہ ہوتی تو بینظیر کی موت کے بعد پیپلز پارٹی سندھ کے علاوہ پنجاب، خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں بری طرح ہار گئی تھی۔ پھر کوئی تجزیہ نگار بولا، نون لیگ کو دراصل نواز شریف کی بہادری کا ووٹ ملے گا، اینٹی اسٹیبلشمنٹ ہونے کا ووٹ ملے گا۔ بھائی! اگر اینٹی اسٹیبلشمنٹ ہونا ہی بہادری کی علامت ہے تو پھر ملا فضل اللہ کی تو ہر امیدوار کو تصویریں لگا کر ووٹ مانگنا چاہیے تھا۔ ان تجزیہ نگاروں کی ان خواہشات کا اظہار تو اس دن سے ہونا شروع ہوگیا تھا جب یہ اعلان ہوا تھا کہ پولنگ اسٹیشنوں پر فوج تعینات ہوگی۔ ہر کوئی کہتا دیکھو الیکشن کا ہنگامہ ہوگا، ایک پولنگ اسٹیشن پر ہزاروں افراد جمع ہوں گے، اگر اس دوران کسی فوجی سے ہاتھا پائی ہوگئی تو پھر گولی چل جائے گی، گولی چل گئی تو فساد پھیلے گا، فساد پھیلے گا تو شہروں میں ہنگامے پھوٹیں گے اور پاکستانی فوج اپنے ہی شہریوں کے مقابل آ کر کھڑی ہو جائے گی۔ الیکشن کا پورا دن گزرا، ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ رزلٹ لیٹ ہوئے تو ان کے چہرے کھل اٹھے۔ ایک بار پھر ابن صفی کے ناول کی کہانیاں واپس لوٹ آئیں۔

الیکشن کے اس سارے قضیے میں نقصان صرف ایک طبقے کا ہوا ہے اور وہ ہے مذہبی طبقہ جو اس ملک میں صرف اور صرف الیکشن کے لیے اکٹھا ہوتا ہے، ووٹ کی بھیک مانگتا ہے، لوگوں پر کفر کا الزام لگاتا ہے، یہود و نصاریٰ کا ایجنٹ بناتا ہے، لیکن جیسے ہی الیکشن ختم ہوتا ہے یہ سب کے سب جمعے کے خطبوں میں اپنے مسلکی تیر و نشتر سے مسلح ہو کر دوبارہ ایک دوسرے کے خلاف میدان میں نکل آتے ہیں۔ عینی صلحا و علما نے ووٹ کی بھیک مانگنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کسی اور شخص اور جماعت کو کسی کی دوستی اور محبت کا اتنا نقصان نہیں ہوا ہوگا جتنا سراج الحق کو مولانا فضل الرحمن کی دوستی اور جماعت اسلامی کو جمہوری تصور سے محبت کرنے سے ہوا۔ ۲۹ جون ۲۰۱۸ء کو سراج الحق صاحب کے ایک بیان نے مجھے اس قدر تکلیف دی کہ پوری باسٹھ سالہ زندگی میں کبھی اتنی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے اس وقت کالم اس لیے نہیں لکھا کہ کہیں جماعت اسلامی والے اپنی ہار کا الزام مجھ پر نہ ڈال دیں۔ سراج الحق صاحب ووٹ کی بھیک مانگتے ہوئے یہاں تک کہہ گئے کہ ''مینڈیٹ کا احترام ہوتا تو بنگلہ دیش نہ بنتا''۔ اس بیان کا ایک ایک لفظ میرے سینے میں تیر ہوگیا۔ یہ بیان دیتے ہوئے سراج الحق کو عبدالقادر ملا اور مطیع الرحمٰن نظامی کی

پھانسی پر جھولتی ہوئی لاشیں بھی یاد نہ آئیں، یہ البدر اور الشمس کے شہداء کو بھی فراموش کر گئے۔ کیا شیخ مجیب الرحمن کے بارے میں وہ ساری باتیں جھوٹ تھیں جو پروفیسر غلام اعظم ہمیں آخری وقت تک بتاتے رہے۔ کیا ووٹ کی بھیک اور نواز شریف اور فضل الرحمٰن کا بیانیہ اتنا مقدس اور محترم ہے کہ امیر جماعت اسلامی اپنے شہیدوں کو بھول جائے۔ درست کیا ان لوگوں نے جنہوں نے آپ کو آئینہ دکھایا۔ ان سب لوگوں کو دکھایا جو عالمی اور بھارتی ایجنڈے کے غلام ہو گئے تھے۔

ایک کلچر، ایک تہذیب کا نعرہ تو ذوالفقار علی بھٹو نہیں لگا سکا تھا۔ اس نے آریانا فلاچی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا مجھے اس دن پتہ چلا تھا کہ ہندو اور ہم علیحدہ قوم ہیں جب میں اپنے ہندو دوستوں کے گلاس سے پانی پینے لگا تو انہوں نے کہا تمہارا گلاس دوسرا ہے۔ لیکن یہاں تو ایک طرح کا آلو گوشت کھانے والے نواز شریف کا بیانیہ خریدنے والے بہت تھے۔ لیکن لوگوں نے بتا دیا کہ اے لیڈران کرام! ہمیں معلوم ہے کہ ہماری اساس کیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو ایک ہزار سال تک کشمیر سے جنگ کرنے کے بیان کی وجہ سے ووٹ ملے تھے اور نواز شریف کو سرحدیں ختم کرنے کے بیانیے پر نفرت میسر آئی۔ مولانا مودودی کے قریبی ساتھی رانا نذر الرحمن ۲۰۱۳ء کے الیکشن کے بعد میرے پاس آئے اور زار و قطار رونے لگے۔ کہنے لگے آپ کو پتہ ہے ٹیک سوسائٹی کے پولنگ سٹیشن سے جماعت اسلامی کو کتنے ووٹ ملے تھے، صرف ایک اور وہ میرا تھا۔ یہ وہ سوسائٹی ہے جس میں مستقل درس قرآن ہوتا ہے اور لوگ مولانا مودودی کی کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن وہ اب مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کہاں گئے جماعت اسلامی کے وہ لوگ جو معاشرے میں روشن ستاروں کی طرح ہوتے تھے؟ آج وہ دانشور، ادیب اور پوری دنیا کے سیکولر کس قدر خوش ہوں گے جو کھینچ تان کر مذہبی طاقتوں کو ''مین سٹریم'' سیاست میں لانا چاہتے تھے۔ ان تمام علماء کو جمہوریت کی سیڑھی پر چڑھانا چاہتے تھے۔ کمال دیکھیے کہ جمہوریت کی اس سیڑھی سے یہ علماء صرف پھسلے نہیں بری طرح گرے ہیں، بلکہ عوام نے گرایا ہے۔ آج رینڈ کارپوریشن کے ان مفکروں کے لیے خوشی کا دن ہے جو یہ کہتے تھے کہ مغرب اگر اسلام اور مسلمانوں کو اپنا مطیع بنانا چاہتا ہے تو ان مذہبی طاقتوں کو جمہوری سیاست اور جمہوری اداروں کی لت ڈال دے، پھر دیکھے وہ کیسے تمہیں، تمہارے نظام اور طرز معاشرت کو اپنا آئیڈیل بنا لیں گے۔ آج ان سیکولر، لبرل اور جدید مذہبی دانشوروں کی خوشی کا دن ہے جو مذہبی طاقتوں کو جمہوریت کے اکھاڑے میں کھینچ کر ان کی رسوائی چاہتے تھے۔ (دانش ڈاٹ کام)

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

عبداللطیف خان گنڈاپور [۱]

جماعتِ اسلامی۔انحطاط اور احیاء

گفتگو کے آغاز ہی میں یہ وضاحت کردوں کہ یہ چند سطور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور دین کے تقاضوں کی بنیاد پر قلم بند کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی کمزوریوں،لغزشوں، گناہوں اور عیوب کا خوب ادراک ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا طلب گار ہوں۔ مَیں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تحریک سے وابستہ ہوں۔تحریکی لٹریچر کا خوب مطالعہ کیا ہے۔مولانا مودودیؒ اور دیگر اکابرین کی محفلوں میں حاضری دیتا رہا ہوں۔گزشتہ پچاس سالہ تحریکی وابستگی اور تعلق کی بنیاد پر انتہائی دردمند دل کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔

محترم امیرِ جماعت (جناب سراج الحق صاحب) کے انتخاب کے بعد پہلے سالانہ اجتماع سے کچھ عرصہ پہلے میں نے ان کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا تھا اور یہ عرض کی تھی کہ باقاعدہ رکن نہ ہونے کی وجہ سے مجھ سے یہ حق نہیں چھینا جا سکتا کہ مَیں جماعت اور اس کی قیادت کے بارے میں جو''حق''سوچوں اسے بیان کردوں۔ مَیں نے عرض کیا تھا کہ جماعت کا امیر منتخب ہونے کے بعد آپ کو جماعت ان اصولوں کے مطابق چلانا ہوگی جو بانیٔ جماعت کا ویژن تھا اور دوسرا یہ کہ جماعت کے امیر کا منصب دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح صدارت کا منصب نہیں کہ اسے اپنے مفادات اور غیر اسلامی فکر کے لیے استعمال کیا جائے۔ جماعت اسلامی دورِ حاضر کی امتِ مسلمہ کی وہ تحریک ہے جس کی طرف رہنمائی کی خاطر امت دیکھ رہی ہے۔لہٰذا کسی قیمت پر بنیادی اصولوں اور منہج سے انحراف برداشت نہیں کیا جاسکتا اور انہیں احساس دلایا تھا کہ طبقاتی کشمکش اور غریب وامیر کی جنگ کی بجائے اسلام کی مبنی برحق دعوت اور فریضۂ اقامتِ دین پر مسلمانوں کو ابھاریں۔محترم امیر نے پشاور کی ایک محفل میں صرف اتنا فرمایا کہ آپ کا خط میں نے پڑھ لیا ہے لیکن بعد کے واقعات نے مجھ پر عیاں کردیا کہ شاید خط میں اٹھائے گئے نکات سے اتفاق نہیں کیا گیا۔

[۱] سابق ناظم اسلامی جمعیت طلبہ صوبہ سرحد (خیبر پی کے)

جماعتِ اسلامی ایک تحریک تھی لیکن ۱۹۸۷ء کے بعد افغان جہاد کے دوران دولت کی ریل پیل اور اسلحہ کی فراہمی سے ماحول بالکل بدل گیا اور جماعت اپنے کارکنوں کو دولت کے فتنے اور مراعات کی سیاست سے محفوظ نہ رکھ سکی۔ اس ماحول میں الزامات در الزامات اور خیانت تک کے عیوب نمایاں ہونے لگے۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ جماعتِ اسلامی اختلافات کا شکار ہوگئی۔ پہلا مرحلہ ۱۹۵۷ء کا تھا لیکن چونکہ امیر جماعت بقیدِ حیات تھے انہوں نے حالات کو سنبھالا اور تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل کی تین گھنٹوں کی تقریر میں جماعت کے آئندہ طریقِ کار کی پوری وضاحت کر کے ارکان کو مطمئن کر دیا۔ اس تقریر میں سب سے اہم نکتہ جماعت کی دعوت کے سلسلے میں سیاسی شعبے میں توازن کا تھا جو کہ بیک وقت دوسرے کاموں سے مربوط تھا۔ لیکن بعد میں ہم عدم توازن کا شکار ہو گئے اور ہماری پارٹی زیادہ تر سیاسی ہوگئی، اب جماعت کا کارکن مکمل سیاسی ہوگیا۔

جماعت اب Issue based سیاست کرنے لگی۔ جہاں کوئی ایشو اٹھا، چاہے وہ اہم تھا یا غیر اہم، جماعت میدان میں کود پڑی جس سے بہت سے انسانی اور مالی وسائل ذائع ہو گئے اور ہم اپنے نصب العین اور Vision سے دور ہوتے گئے اور نظریاتی اور فکری اساس کمزور ہوتی گئی۔ ہر روز ہڑتال، جلوس، دھرنے دینا اور مطالبات کی عدمِ منظوری پر احتجاج کی دھمکی دینا معمول بن گیا۔ اور اس پر لطف یہ کہ یہ سب کچھ ہنگامی طور پر ہوتا، لہٰذا ان میں مایوس کن حد تک حاضری ہوتی اور یوں ہماری رہی سہی قوت بھی عوام اور دیگر پارٹیوں کے سامنے Expose ہوگئی۔

جماعت کی پے در پے سیاسی غلطیوں اور غیر موثر سیاسی فیصلوں کی بناء پر ملکی سیاست میں ان پر مختلف الزامات لگے، جیسے مارشل لاء کی بی ٹیم، ایجنسیوں کی دی گئی گائیڈ لائنز پر ان کے سیاسی ایجنڈا کی تکمیل وغیرہ جس میں Credibility اور ساکھ کو بہت نقصان پہنچا۔

ان پر مستزاد یہ کہ لوگوں پر ہماری Capacity اور اہلیت عیاں ہوگئی۔ اور وہ جو ایک تاثر تھا کہ جماعت تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت ہے اور اس طبقہ میں اس کا بہت اثر ہے، وہ مفقود ہو گیا۔ اور خود جب جماعت کو حکومت میں Share ملا تو اس کے پاس اہل لوگوں کی نہ

صرف کمی تھی بلکہ مکمل فقدان تھا۔لیکن جماعت نے اس کے باوجود اس طرف سے آنکھیں بند رکھیں کیوں کہ یہ ایک صبر آزما اور مشکل کام تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۸ء میں مالاکنڈ سوات میں میری ملاقات قاضی صاحب سے ہوئی تھی اور ان سے مَیں نے یہ عرض کیا کہ اگر بفرضِ محال حکومت آپ کو دے دی جائے تو کیا آپ کے پاس اس کے مختلف شعبوں کو چلانے کے لیے اہل افراد موجود ہیں؟ اور آپ نے کیا اس کے لیے ہوم ورک اور منصوبہ بندی کر رکھی ہے؟ تو مرحوم نے ہنستے ہوئے اپنے ساتھ دو دوسرے ذمہ داروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ لوگ کام کریں گے اور پھر ایم ایم کی حکومت میں ہماری Incapacity اور Incapibility ظاہر ہوگئی۔

سیاسی سرگرمیوں میں اکثر ناگزیر ہو جاتا ہے کہ آپ دوسری پارٹیوں کے ساتھ سیاسی اتحاد میں شریک ہوں۔ ان اتحادوں میں شریک پارٹیاں اپنی انفرادی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے اتحاد کرتی ہیں۔ اور یوں ان کی اپنی شناخت اور پروگرام Intact ہوتے ہیں۔ چند مشترکہ نکات پر ان کی سیاسی جدوجہد اور تعاون جاری رہتا ہے۔لیکن ہمارے ہاں یہ ہوا کہ سیاسی عدم بالغ نظری کی وجہ سے اپنی شناخت ہی کھو بیٹھے اور کارکنوں کو ہم نے پریشانی کے عالم میں تنہا چھوڑ دیا۔ اتحاد کی سیاست میں معلوم نہیں کہ ہمیں کس مجبوری کی بناء پر یا کس دباؤ کی وجہ سے ان پارٹیوں اور گروپوں سے سے اتحاد کرنا پڑا جو یا تو مذہبی لحاظ سے ہمارے کٹر مخالف تھے اور ہم پر کفر تک کے فتوے لگا چکے تھے اور یا ان سے اتحاد کرنا پڑا جو خالصتاً سیاسی لوگ تھے۔ فحش کلچر، خواتین کی آزادی، مساوات اور سیکولر پاکستان کے داعی تھے۔ دونوں مواقع پر ہم انتہاپسندی کا شکار ہوئے اور افراط وتفریط میں مبتلاء ہوئے اور اس سب کارنامے میں ہم اپنا نصب العین اور منزل بھول گئے۔ مذہبی آوارگی، بیہودگی اور فحاشی کے کلچر نے جماعت کے کارکنوں کو بہت مایوس اور بدظن کر دیا۔ اتحادوں کے فوائد اور نقصانات دونوں ہوتے ہیں۔ فوائد بعض لوگوں کے خیال میں یہ ہوئے کہ مذہبی طبقہ کچھ نہ کچھ ہمیں برداشت کرنے لگا اور یوں ہمارا ایک مودودی فرقہ بن جانے کا تاثر زائل ہونے لگا۔لیکن ان مذہبی اتحادوں اور دوسرے اتحاد نے ہمیں ان پر لگائے گئے کرپشن کے الزامات اور فحاشی کے کلچر پھیلانے میں شراکت دار کی حیثیت دے دی۔ ہم لاکھ کہتے رہے کہ ہمارے وزراء پاک صاف ہیں لیکن

دوسروں کے گناہوں میں آپ حکومت میں شیئر ہولڈر (Share holders) کی حیثیت سے بری الزمہ نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ ایک اجتماعی ذمہ داری تھی۔

ان اتحادوں کی اور جماعت کی روز افزوں سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے جماعت اصولوں کی سیاست سے دست بردار ہونے لگی اور مختلف ایشوز (Issues) پر سیاسی شہرت اور عوام کے رخ کو دیکھتے ہوئے پالیسیاں مرتب ہونے لگیں۔ حالانکہ قیادت کا کام لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے نہ کہ بھیڑ چال میں مبتلاء ہونا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہم اس میدان میں دھکیل دیے گئے جو ہمارا میدان ہی نہیں تھا۔ وہاں پہلے سے ہی بڑے سے بڑا کھلاڑی موجود تھا اور انتہائی چالاکی سے آپ کو سیاسی میدان میں جمہوریت کے لیے پیرامیٹرز (Parameters) دیے گئے، جس کے اندر آپ سیاست پر مجبور ہو گئے۔

ان اقدامات کا یہ نتیجہ نکلا کہ ظاہری طور پر آپ حکومتوں میں اسلامی نظام کے لیے پیش رفت کے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے شریک ہوئے لیکن عملاً اس سمت میں کوئی اقدام نہ کر پائے۔ بلکہ آپ سے وہ اقدامات کرائے گئے جو عام حالات میں شاید آپ نہ کر پاتے مثلاً خیبر پی کے میں بلدیاتی اداروں کی تشکیل اور اس کے ڈھانچے کے بارے میں جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کی سربراہی جماعت کو دی گئی لیکن بشمول دیگر دفعات (Articles) کے خواتین کو بے انتہا نمائندگی پر بھی این جی او (NGo) کے تیار کردہ ڈرافٹ کو من وعن قبول کرلیا گیا اور اس میں کسی تبدیلی کی خواہش کا اظہار بھی نہیں کیا گیا۔ پھر اسی طرح خیبر پی کے میں دونوں حکومتوں کے دوران اسلامی اقدامات میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی اور پہلی ایم ایم اے کی حکومت میں اپنی ہی حکومت کے خلاف فحش بالبورڈز (Bilboards) پر احتجاج کرنے والی جماعت اسلامی دوسرے اتحاد میں اس فحاشی کے کلچر پر خاموش رہی بلکہ تحریکِ انصاف کے ساتھ پشاور میں ٹورازم (Tourism) اور انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کے فیشن شو اور کیٹ واک (Fashion show and cat walk) کے پروگراموں پر مجرمانہ خاموشی نے ہماری مفادات کی سیاست کو نمایاں کردیا۔

دوسری طرف ہم وفاق میں بھی اسلامی اقدامات کے بارے میں کچھ نہ کر سکے اور

ہمارے نمائندوں کی کارکردگی اس لحاظ سے مایوس کن رہی۔سود کے معاملے پر پارلیمنٹ کے باہر بھی ہم کوئی موثر احتجاجی مہم نہ چلا سکے اور قاضی صاحب کے دور میں مشرف نے جب تحفظ خواتین بل پاس کروایا تو ہم بھاری تعداد میں نمائندگی کے باوجود کچھ نہ کر سکے۔اس پر مطمئن رہے کہ قاضی صاحب اکیلے نے احتجاج کر دیا، باقی ایم این ایز نے اس کی بھی کوشش گوارا نہ کی۔

مفادات کی سیاست اور روز افزوں شہرت اور مناصب کی بھوک نے ہمیں اس درجے پر پہنچا دیا کہ جماعت کے امیر بن جانے کے بعد بھی ہمارے امیر نے وزارت خزانہ کا منصب نہ چھوڑا۔اور یوں جماعت کے اس منصب کی بے توقیری کی۔اور تحریکِ انصاف یا ثانوی قیادت میں کابینہ کے ایک ماتحت وزیر کی حیثیت میں شریک رہے۔اور سیاسی میدان میں مکالمہ میں ان کے ساتھ دوسری پارٹیوں کی دوسری یا تیسری درجے کی قیادت Parleys کرتی رہی بلکہ اس ضمن میں تحریک انصاف کا رویہ تو بہت ہی جارحانہ تھا۔تحریکِ انصاف کی طرف سے بار بار الزامات اور منافقانہ رویے کے خصوصی الزام پر ہم نے اپنے دفاع کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ خاموشی کو مصلحتاً بہتر جانا۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ خیبر بنک کے سکینڈل میں ہمارے وزیر پر ماتحت بنک نے کسی کی شہہ پر سنگین الزامات لگائے لیکن ہم بوجوہ اس معاملے کو بھی ہینڈل نہ کر سکے۔ وزارتوں کے ساتھ چمٹے رہنے کی وجہ سے تحریکِ انصاف ہماری بے بسی کا تماشا لگاتی رہی کہ یہ دعوے دارانِ اسلام چند وزارتوں کی خاطر کس کس طرح حکومت کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔

ہم نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ الیکشن جیتنا اور اس کے ذریعے اپنی قوت منوا کر نظام کی اقامت کا مقصد حاصل کرنا مقصود قرار دینے لگے اور یوں دوسروں کی طرح ہم Electables کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے کہ شاید اس طرح حکومت حاصل کر پائیں اور Electables کی تعریف وہی ہے کہ جو الیکشن کی سائنس جانتے ہیں یعنی وہ ہر حربہ اور طریقہ جس سے وہ منتخب ہو جائیں۔ہم یہ بات بھول گئے کہ وہ Electables ہمارے پاس کیوں آئیں گے جب کہ ان کے پاس دوسری پارٹیوں کے Options اور وہ بھی بہت بہتر Options موجود ہیں ، یوں ہم اس خالص دنیاوی اور میکیاولی سیاست

(Mechiawellian Politics) میں ان کے جوڑ کے نہیں ہیں۔ اس سارے کھیل میں جہاں ہم نے The end justifes the means کا طریقہ اختیار کیا، وہاں ہم اس میں بھی بری طرح ناکام رہے اور اپنی عاقبت بھی خراب کی۔

آخر ہم میں عجلت پسندی کیوں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں اس کا مکلف نہیں ٹھہرایا وہ تو اپنے مبارک دین کو اس طرح کے غلط، بھونڈے اور گناہ سے بھرپور اقدامات سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا؟ پھر ہم کیوں اس میں غلطاں اور شیطان کے دھوکے کا شکار ہو رہے ہیں۔ دین میں کوئی شارٹ کٹ (Short cut) نہیں۔ اس عجلت پسندی نے ہمیں ایک اور مخمصے میں پھنسا دیا۔ اور وہ ''عوامیت'' کا نعرہ تھا۔ لوگوں تک Approach کیا جائے اور اس سلسلے میں فطری طریقہ کی بجائے ہم نے مصنوعی طریقے اختیار کیے۔ ہم نے ''پاسبان'' بنائی، ہم نے ''شبابِ ملی'' بنائی اور اب Youth بنائی اور ان کو Festivals کے نام پر دین کے معاملات میں الجھایا۔ آخر ہم کسے دھوکہ دے رہے ہیں؟ ہم ایک بامقصد، اصولی دعوت سے انحراف کیوں کر رہے ہیں؟ اور پھر یہی Youth وغیرہ کے کارکنان اپنی ان ہی دلچسپیوں کی خاطر راتوں رات دوسرے گروہوں اور پارٹیوں میں جا بیٹھتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کا اصل سرمایہ وہ نوجوان تھے جو اسلامی جمیعتِ طلبہ سے منسلک تھے ان پر دوران طالب علمی جمیعت منظم طریقے سے محنت کرتی ہے۔ ان کو دینی لٹریچر کا مطالعہ کرایا جاتا ہے اور ان کے دین کے فہم پر کافی کام ہوتا ہے۔ لیکن جماعت نے اس اہم فورم کو نظر انداز کیا۔ اور اگر استعمال کیا تو سیاسی مقاصد کے لیے۔ حالانکہ جماعت کے لیے کارآمد بنانے کے لیے منصوبہ بندی کرنی چاہیے تھی جو درست طور پر نہ ہوسکی۔

جب یہ ضرورتیں بڑھنے لگیں تو دین کا اصل مقصد پیچھے رہنے لگا۔ عاقل کارکن جو رضاکارنہ طور پر دین کا کام سمجھ کر جماعت کی دعوت کا کام کرتے تھے آہستہ آہستہ غیر فعال ہونے لگے اور غیر تربیت یافتہ اور سیاسی نعروں کی پیداوار آگے بڑھنے لگے اور یوں ساری فضا ہی سیاسی ہوگئی۔ سب مشاورت بھی انہی سے ہونے لگی جو بقول ان کے سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ قد کاٹھ تھا، جاہ ومنصب اور دولت تھی، اور یوں غریب اور مخلص کارکن پیچھے ہٹ گئے اور

جماعت فکری لحاظ سے بانجھ ہونے لگی۔ جماعت کی قیادت کی نااہلی کے بارے میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ کسی موقعے پر بھی اپنی پوزیشن صاف نہ کرسکی اور نہ پالیسیوں کی وضاحت کرسکی۔

جماعت کی غیر معتدل سیاسی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ذمہ دار اور عہدے دار اس کا حریص رہا کہ وہ بھی کسی طرح امیر کو دیکھتے ہوئے پارلیمنٹ میں پہنچ جائے، وہ امیر جو پہلے وزارت میں پھر امیر بنا اور پھر Senator بنا۔ اور اس پر بھی قناعت نہ کرسکے اور قومی اسمبلی کے امیدوار بن بیٹھے لیکن شکست کھائی۔ ہر امیر اور عہدے دار کے بھی دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی اور پھر جو ایک بار امیدوار بن گیا چاہے ہارا یا جیتا اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اب اس خواہش سے کبھی دست بردار نہیں ہوگا اور یوں اختلافات بڑھتے گئے۔

شہرت اور منصب کے اس لالچ میں وہ اپنی اصلی دعوت کی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو گئے اور اپنے ووٹرز کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جماعت کے دعوتی حلقے جو پہلے رہائشی بنیادوں پر تھے اب وہ انتخابی حلقوں کی بنیاد پر بن گئے۔ اور ان کے امیر PF حلقہ فلاں کہلانے لگے۔ ان حلقوں میں ابتداءً ہفتہ وار اجتماعات منعقد ہوتے تھے اور ان میں قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا جاتا تھا لیکن بعد میں سیاسی عدم توازن کی وجہ سے یہ حلقے سیاست کی نظر ہونے لگے یا تو اجتماعات Irregular ہوگئے یا ان میں عدم دلچسپی کی وجہ سے حاضری بھی کم ہوتی گئی اور کہیں کہیں تو بالکل ختم ہوگئے۔ اور جہاں رہے تو وہاں رسمی درس کے بعد سیاسی بیٹھک جم جاتی ہے اور یوں وہ سیاسی گفتگو پر ختم ہوجاتے ہیں۔

سیاسی میدان میں ہم نے اکثر اپنے آپ کو Over estimiate کیا۔ اور اس زعم میں پہلے تو یہ ریت رہی کہ دعوت کے خوبصورت نام پر حلقے سے امیدوار کھڑے کرنے لگے اور یوں اپنے ذرائع اور وسائل جو کارکن بڑی محنت سے جمع کرتے ہیں، ضائع کرنے لگے۔ اور شکست کے بعد جھوٹی تسلیوں کا دور شروع ہوجاتا ہے کہ کم از کم دعوت تو پہنچ گئی ہے۔ لیکن ہر کارکن اور قیادت یہ سمجھتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ اتنا پیسہ اور وسائل تو وہ اور طریقوں سے بھی اس دعوت کے عام کرنے میں بہتر طور پر استعمال کرسکتے تھے۔ اس

کے لیے الیکشن میں رسوائی، تذلیل اور حوصلہ شکنی کیا ضروری تھی؟ پھر اس میدان میں بھی اصول پسندی اختیار کی جاتی تو بہتر ہوتی لیکن یہاں بھی خالص دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح ووٹ خریدے گئے، لالچ دیے گئے اور وہ کھیل کھیلے گئے جو ایک عام سیاسی پارٹی کھیلتی ہے۔ ہم میں اور ان میں فرق کیا ہوا؟ مولانا مودودیؒ سے ۱۹۷۰ء میں الیکشن میں شکست کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ مَیں اس بات پر مطمئن ہوں کہ ہم نے دھوکے، فراڈ، بے ایمانی اور لالچ کی بنیاد پر ووٹ نہیں مانگے اور یہی ہمارا اور دوسروں کا فرق ہے۔ لیکن کیا اس طرح کا دعویٰ ہم اب کر سکتے ہیں؟ اب تو برملا کہا جاتا ہے کہ الیکشن لڑنا ہے تو وہ سارے Tactics اختیار کرنا ہوں گے جو الیکشن کے لیے ضروری ہیں اور عمران خان کے الفاظ میں یہی الیکشن کی سائنس ہے۔

جماعتِ اسلامی، قیادت، ارکان اور ادارے

جماعتِ اسلامی کے دستور میں ارکان اور مختلف ذمہ داران اور عہدے داران کے لیے جو معیاراتِ علم، دیانت اور تقویٰ کے رکھے گئے ہیں، آپ کو ان کی کثیر تعداد بشمول اعلیٰ قیادت اس معیار پر پورا اترتے دکھائی نہیں دیتی۔ ابتدائی ارکان اور کارکنان کے سلسلے میں قیادت ان معیارات کی طرف خود توجہ دیتی رہی، ان کی عبادات، قرآن وحدیث کا مطالعہ اور فہم، تقویٰ اور معاملات میں حرام وحلال اور دینی وتحریکی لٹریچر کے مطالعہ کا خوب بندوبست کیا جاتا تھا۔ ہر کارکن اور امیدوار رکنیت کو کم از کم متعلقہ نصاب پڑھایا جاتا اور کافی جانچ پڑتال کے بعد ان کو رکن بنایا جاتا، کیونکہ ارکان ہی جماعت کی ضلعی قیادتوں سے لے کر صوبائی اور مرکزی قیادتوں اور مجلس شوریٰ کا انتخابی حلقہ (Electoral College) ہیں۔ اس معاملے میں کسی صورت کوئی کاہلی، سستی، برداشت نہ کی جاتی تھی اور جب وہ ارکان بن جاتے تب بھی ایک مستقل نظامِ نگرانی وتربیت ہوتا تھا تاکہ وہ بہتر عملی مسلمان بنے رہیں۔

لیکن وہ معیار پہلے بیان کی ہوئی وجوہات کی بناء پر برقرار نہ رہا۔ اور مفادات اور مَیں تو یہ کہوں گا کہ Lobbying کے لیے بھی ارکان کی بھرتی شروع ہوگئی۔ بھرتی کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ رپورٹس کے مطابق بعض مقامات پر چند دنوں میں اور بعض میں

راتوں رات ارکان بنائے گئے ۔ اب ظاہر ہے یہ خود بخود تو نہیں بن سکتے تھے بلکہ کسی کی آشیر باد اور تقاضے کے تحت ہی بنائے گئے تھے۔

جب یہ معیار ہو جائے کہ کردار کی کوئی حیثیت نہ ہو، آپ کی کوئی مالی، کاروباری، زرعی، تعلیمی، سیاسی حیثیت ہو اور ساتھ ہی اگر Nuisance Value ہو تو آپ کو رکن بننے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اس الیکٹرول کالج (Electoral college) سے پھر آپ کیا توقع رکھیں گے کہ وہ آپ کے لیے مناسب افراد، صوبائی، ضلعی اور مرکزی اداروں میں بھجوا سکے۔ ظاہر ہے جتنا ان کا اپنا فہم اور سوچ ہو گی، وہی ان کا انتخاب ہو گا اور ان پر موثر حلقے بھی آسانی سے اثر انداز ہو سکیں گے۔ کیونکہ ان لوگوں میں کردار کی خامیوں کی وجہ سے ان کا اثر و نفوذ بڑھتا جاتا ہے اور پھر ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کی مثالیں ہم ماضی قریب میں دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح آپ کی قیادت اور ان ارکان کو موثر حلقوں نے نہ صرف آپ کے اندرونی انتخابات میں استعمال کیا بلکہ ملکی سیاست میں بھی۔

جماعت میں جب منصب کے ساتھ مراعات جڑ گئیں تو پھر مناصب پُرکشش اور باعثِ مرتبہ و منزلت بن گئے اور کیوں کہ کردار وہ نہ تھا جو مطلوب تھا اور دین کا فہم محض روایتی تھا اس لیے مناصب کے لیے باقاعدہ کشمکش اور Lobbying شروع ہو گئی جس سے بعض مقامات پر ناخوشگوار صورتحال بھی پیش آتی رہی اور قیادتیں اور ذمہ داران یہ بھول گئے کہ دین کا اصول یہ ہے کہ جو منصب کے پیچھے بھاگے اسے منصب نہ دو، وہ اس کے لیے سب سے زیادہ نااہل ہے ۔ ارکان وغیرہ کے عہدوں اور مناصب کے معیار پر Compromise جماعت کے انحطاط اور آخر کار تباہی پر منتج ہوا۔

ہمہ وقتی کارکن اور تنخواہ دار عہدے داروں اور منصب داروں کا تصور جماعت میں صرف ان چند لوگوں کے لیے تھا جو جماعت کے لیے بالکل ناگزیر تھے اور جن کے مالی حالات اس کے متحمل نہیں تھے کہ وہ اپنا پورا وقت جماعت کو دے سکیں۔ لیکن بعد میں یہ تصور اتنا پھیلا اور اس کا اتنا غلط استعمال کیا گیا کہ اب رضا کارانہ خدمات کی بجائے تنخواہ دار طبقہ وجود میں آ گیا اور ایک Bureaucratic set up بن گیا جو سرکاری ملازم کی طرح عدم توجہ اور روٹین کی

یا رسمی کارروائی کرنے لگا۔ ظاہر ہے کہ ایسے Set up سے کیوں کر نتائج حاصل Formality کیے جاسکتے ہیں؟ بعض مقامات پر یہ چھاپ اتنی بڑھنے لگی کہ قیادت تک کارکنان کی رسائی محدود ہوگئی اور یوں قیادت اور عام کارکنان میں فاصلے بڑھنے لگے۔ مجھے خود ایسے تجربوں سے گزرنا پڑا۔ سوائے ایک آدھ موقعہ کے مجھے میرے message اور فون کے جوابات نہیں دیے گئے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ قصداً نہیں دیے گئے ہوں گے بلکہ بعض اوقات قائدین کی مصروفیتیں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ وہ وقت نکال نہیں پاتے لیکن چونکہ کارکنان کے ساتھ رابطہ اسلامی تحریک کی بنیاد ہے تو اسے ترجیحِ اول ملنی چاہیے۔

قیادتوں کے انتخاب میں صوابدیدی اختیارات کی بناء پر مداخلت کی گئی۔ استصوابِ رائے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس حلقے کے ارکان یا کارکنان کی رائے معلوم کرلیں اور پھر ان کی رائے کا احترام کرتے ہوئے مقامی قیادت کا فیصلہ کریں۔ لیکن یہاں بعض مقامات پر رائے کا احترام نہ کیا گیا اور گو کہ دستور کی رو سے قیادت کا حق تھا کہ رائے کے علی الرغم اگر ضروری سمجھے تو فیصلہ صادر کردے لیکن یہ کوئی احسن طریقہ نہیں۔ یہ قیادت Impose کرنے والی بات ہوگئی۔ آپ کیوں اس کو Collective wisdom پر نہیں چھوڑ دیتے؟ وہ قیادت ان کارکنوں کے ساتھ کیسے کام کرے گی جو ان کی رائے کے برعکس ان پر ٹھونس دی گئی ہو؟

جب ان ارکان کی مناسب دینی تربیت نہ کی گئی ہو تو انہوں نے ایسی مجلسِ شوریٰ اور عاملہ کا انتخاب کیا جو اکثر کارکنوں کے نزدیک اہلِ رائے نہیں اور وہ وہاں اداروں میں جرأت، حق اور بے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار نہیں کرپاتے اور مصلحت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں اکثریت مفادات اور عہدوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ زیادہ تر ضلعی اور دیگر عہدے داران شوریٰ کے ممبران ہوتے ہیں۔ ایسے اداروں کے ممبران کی نہ تربیت ہوتی ہے، نہ کوئی فکر کی گہرائی بلکہ ایک وقت گزاری ہوتی ہے جو ان کو کرنی پڑتی ہے۔

پھر ان ارکان کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر سیر حاصل گفتگو نہیں کر سکتے اور جن لوگوں نے ان مجالس کا مشاہدہ کیا ہے ان کے خیال کے مطابق ارکان ایک

دوسرے کی دیکھا دیکھی، ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور یوں مشاورت کا جو قرآنی حکم ہے اس کی پاسداری نہیں کی جاتی اور مشورہ نہ امانت کے طور پر دیا جاتا ہے اور نہ اہلیت اور حق کی بنیاد پر۔ لٰہذا جماعت کے تمام اداروں کی بحثوں اور تجزیوں کا معیار گرنے لگا ہے۔

یہ ایک بالکل کبھی حقیقت ہے کہ جماعت کی عوامی حلقوں میں پذیرائی نہیں ہے لیکن ہم کبھی مانتے ہیں اور کبھی نہیں مانتے اور الیکشن کے دنوں میں ہم پر یہ بھوت سوار ہو جاتا ہے کہ بس لوگ ہمارے لیے ترس رہے ہیں۔ بس ان تک پہنچنے کی دیر ہے۔ حالانکہ آسان بات یہ ہے کہ ہر آدمی یہ اندازہ اپنے محلے اور مسجد میں لگا سکتا ہے کہ اس کی جماعت کی حمایت میں کتنے لوگ ہیں اور اس پر آپ پورے صوبے اور ملک کو قیاس کر سکتے ہیں، یہ وہ غلط تجزیے اور Over Estimated اندازے ہیں جو ہر مرتبہ ہمیں غلط فہمی کا شکار کر دیتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ کی شخصیت Dominating تھی وہ اکثر شوریٰ کی مجالس کو Dominate کر لیتے تھے۔ لیکن ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں قاضی صاحب کے دور میں ہوتا تھا کہ وہ شوریٰ کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے اور پالیسی بیان داغ دیتے تھے۔ مولانا مودودیؒ کی شخصیت ایسی تھی کہ انہوں نے جماعت کی بنیاد رکھی تھی، اس کو نصب العین اور فکر دی تھی، ان کے وسیع علم، تجربہ، تقویٰ، رہنمائی، بصیرت، بالغ نظری، وسیع القلبی، وسیع مطالعہ اور قیادت پر سب کو اعتماد تھا۔ وہ شوریٰ کو دلائل سے اپنے موقف پر قائل کرتے تھے اور شوریٰ کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ اب یا تو شوریٰ اپنی رائے کا مکمل اظہار نہیں کر پاتی یا نہیں کر سکتی یا نہیں کرنا چاہتی، ان میں سے کوئی بات بھی مکمل طور پر غلط نہیں۔

مولانا مودودیؒ نے دین کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے علمی اور عام فہم دونوں اسلوب اختیار کیے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ وہ دین کی دعوت کم از کم تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یہ کام نہ رکتا ان کی کوشش بھی یہ تھی اور اس پر پوری محنت صرف کی جاتی۔ لیکن اس محاذ پر کام نہ ہو سکا اور ابتدائی عشروں کے بعد وہ علمی استعداد اور عقلی ذہانت آہستہ آہستہ مفقود ہوتی گئی اور اکابرین کے جانے کے بعد عام کارکنان تو کیا قیادت بھی اس کا شکار ہو گئی۔

آج کارکنان کے پاس اس سرمائے کے علاوہ موجودہ حالات میں اور کچھ نہیں بلکہ وہ جو سرمایہ اس کے پاس ہے وہ اس سے بھی بے پرواہ ہے اور غفلت کا شکار ہے۔ اسے نہ تو تحریک کا پتہ ہے نہ وہ اس کے لٹریچر سے واقف ہے بلکہ بعض تو بانی تحریک کا نام ہی نہیں جانتے کہ اس کے پروگرام اور مشن سے آگاہ ہوں اور نہ قیادت کی طرف سے اس کی دینی اور علمی تربیت کی نشوونما کا مناسب انتظام اور منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ نتیجتاً اب وہ دین کے تصور کو سیکھنے کے لیے کبھی مولانا طارق جمیل کے بیان سنتا ہے اور کبھی جناب غامدی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور یوں وہ ایک مسخ شدہ اور نامکمل تصور دین کے بارے میں تذبذب کا شکار ہے۔ یہ فکری انتشار اس کی دعوت اور اس کے مقاصد پر اثر انداز نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ ہمارا Thought process ہی رک گیا ہے۔

عوام کے اندر دین کا ایک عجیب نامکمل تصور ہے وہ دین کو ایک پرائیویٹ معاملہ سمجھتے ہیں اور 'اللہ لوگ' کا تصور ان کے ہاں پایا جاتا ہے، کہ جس کا کسی سے کوئی سروکار نہ ہو اور ہر وقت ذکر و اذکار میں مستغرق ہو، بس وہی پہنچا ہوا ہے۔ یہ صوفیانہ تصور اور اس پر مستزاد تبلیغی جماعت کا تصور دین جو صرف عبادات کے محدود تصور تک محدود ہے اور دنیا کے جھمیلوں سے کنارہ کشی کی دعوت دیتا ہے۔ ہم ابھی تک عوام کا یہ ثواب اور دین کے تصور کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب وہ اپنے کام کے علاوہ ہمارے کام کو بھی ثواب کا درجہ دے سکیں اس کے لیے منصوبہ بندی کرنا ہوگی جو آگے بیان کروں گا۔

ہمارے لیے کشمکش کا میدان زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ دوسرے ممالک میں اسلام اور سیکولرزم یا باطل کے درمیان واضح اور Open کشمکش ہے اور لوگوں کو حق پہنچاننے میں کوئی خاص مشکل نظر نہیں آتی لیکن ہمارے یہاں دینی میدان میں لوگ روایتی علماء جو جبہ و دستار سے آراستہ ہوں ان کو مستند گردانتے ہیں اور ان امور میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جب کہ آپ کو وہ عام دنیاوی سیاسی آدمی سمجھتے ہیں جو دین کو (ان کے خیال کے مطابق) نہیں جانتا۔ اس سلسلے میں ہمیں کام کرنا ہوگا اور مناسب منصوبہ بندی درکار ہوگی۔

ساتھ ہی ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہم دوسری مذہبی جماعتوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ

افراد میں زیادہ رسائی حاصل کر چکے ہیں جب کہ یہ بات کسی حد تک صحیح ہے لیکن پھر ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تعلیم یافتہ طبقہ ملک میں کتنے فیصد ہے؟ اور میرے خیال کے مطابق ہم اس میں صرف ایک سے دو فیصد تک ہی پہنچ سکے ہیں۔ باقی سب اپنے آپ کو تسلی دینے والی باتیں ہیں۔

پس چہ بائد کرد

مندرجہ بالا تفصیل کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا اقدامات ہو سکتے ہیں جس سے ہم اپنی پیاری تحریک کو انحطاط اور تباہی سے بچا سکیں؟ یہ ہماری اپنی تحریک ہے، ہمیں خلوص کے ساتھ اقدامات کرنا ہوں گے اور اللہ کی رضا کی خاطر کرنا ہوں گے۔ ہمارا مقصد و مطلوب اس کے علاوہ کچھ اور نہ ہے اور نہ ہونا چاہیے۔

قیادتوں کو حالیہ انحطاط اور ناقص کارکردگی کی ذمہ داری قبول کرنا ہوگی اور وہ اس سے کسی صورت بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ ہمیں ان کے خلوص پر کوئی شک نہیں لیکن قرائن سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ قیادت کی اہم ذمہ داری کے اہل نہیں رہے اور ان کی ناقص پالیسیوں اور جماعت کے بنیادی اصولوں سے دانستہ یا نادانستہ انحراف بگاڑ کا سبب بنا ہے، لہٰذا فوری طور پر وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے جماعت اور اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں۔

عبوری دور کے لیے ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جن کے ارکان تقویٰ، علم اور جماعت کے ویژن اور طریقہ کار کے فہم کے لحاظ سے غیر متنازعہ ہوں۔ ان کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہو وہ عبوری طور پر قیادت کے لیے Select کیے جائیں۔ اس کمیٹی کی سلیکشن وہ پانچ رکنی کمیٹی کرے جو پہلے ہی شوریٰ تشکیل دے چکی ہے۔ اور یہ اس طرح ہو کہ موجودہ کمیٹی کے TORs میں یہ اضافی شق Selection والی ڈال دی جائے۔ یوں وہ بااختیار ہو جائے گی۔ اور ارکان کا اجتماع بلا کر یا کوئی اور دستوری صورت نکال کر اس فیصلے کی توثیق کی جائے۔

یہ پانچ رکنی موجودہ کمیٹی بھی اس میں ضم ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں بھی ماشا اللہ ایسے لوگ ہیں جن کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ فکر کی گہرائی اور ویژن کا شعور رکھتے ہیں۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ انٹرنیشنل لیول پر بھی اس کمیٹی کو کوئی نمائندگی دی جائے تاکہ ان کا نقطہ نظر بھی

سنا جاسکے۔

ایک تجویز تو اوپر دی گئی ہے کہ دس ارکان کی کمیٹی اجتماعی اور عبوری طور پر قیادت سنبھال لے لیکن اگر اس میں مشکلات ہوں اور یہ پریکٹیکل نہ ہو تو دیگر متبادل تجاویز بھی اختیار کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً یہ کمیٹی اسی طرح کام کرتے ہوئے منصب کے معیار کو دیکھتے ہوئے خود ہی تین یا پانچ افراد ان ارکان میں سے Select کرے جو تجدیدِ رکنیت کے بعد ارکان بنے ہوں۔ اور پھر ان کا یہی Electoral college انتخاب کرے اور مستقل امیر اور دوسرے عہدے دار چن لے۔

اس طرح یہ انتخاب Porjection based نہیں ہوگا۔ موجودہ انتخاب میں خرابی یہ ہے کہ شوریٰ ان ارکان میں سے سلیکشن کرتی ہے جن کے پاس کوئی وزارت یا کوئی جماعتی عہدہ رہا ہو یا اس کو دورے کروا کر مختلف مقامات میں پروجیکٹ کیا گیا ہو۔ اس میں میرے خیال میں قرآن و حدیث کا علم، بالغ نظری، وسعتِ مطالعہ، تقویٰ، حق بات کہنے کی جرأت اور حالات حاضرہ کا مکمل ادراک اور عالمی استعمار اور کفر کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شعور رکھنے والی صفات کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔

ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ایک Fact finding committee ان لوگوں کی بنائی جائے جو جماعت کے ارکان کے علاوہ ہوں اور جن کی حالات پر گہری نظر ہو، ان میں مشہور صحافی، کالم نگار، اور تجزیہ نویس ہوں جو ملکی اور بین الاقوامی امور پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ اس کی حیثیت ایک Third Party Audit کی ہو۔ Local Audit میں تو سب اچھا کی رپورٹ ملتی ہے۔

سیاست سے کنارہ کش تو نہیں ہوا جاسکتا۔ ہاں البتہ عبوری دور کے لیے جس میں یہ کمیٹی کام کرے وہ سیاست میں زیادہ فعال نہ ہو۔ البتہ اس بات کا آپ کو قدرتی طور پر ایک موقع بھی فراہم ہوگیا ہے کہ آپ کی اسمبلیوں میں نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہ کمیٹی ارکان کو اعتماد میں لے کر دستور کے معیار کے مطابق ارکان کی تجدید رکنیت کا اہتمام کرے اور ارکان کا فرداً فرداً اس ضمن میں انٹرویو کرے اور جو ارکان اس معیار پر

پورے نہ اتریں ان کو ارکان کی لسٹ سے نکال کر امیداوار رکنیت کی فہرست میں ڈال دیں اور پھر ان کے لیے وہ تمام تربیتی اور فکری و دینی اقدامات کرے جو ان کے رکن بننے کے لیے ضروری ہیں جس میں مطالعہ قرآن وحدیث کورس، عبادات ومعاملات شامل ہیں۔ اس معاملے میں بہت زیادہ سختی ہونی چاہیے۔

ارکان ودیگر عہدوں اور مناصب کے لیے حلف کو رسمی کارروائی نہ سمجھا جائے اور ان کو باور کرایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر حلف اٹھانا اور پھر اس کی پاسداری نہ کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اس سے دنیا اور آخرت کتنی خراب ہوسکتی ہے؟ اور یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جس میں خیانت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

☆ شوریٰ کے ارکان جن کا آئندہ انتخاب ہو اس میں بر بنائے عہدہ والے ممبران کا ووٹ نہ ہو البتہ، مباحثے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

☆ امیر کے استصوابِ رائے کے برعکس صوابدیدی اختیارات ختم کردیے جائیں۔

☆ تمام عہدے داران پر پابندی عائد کردی جائے کہ وہ جماعتی ذمہ داریوں کے ساتھ الیکشن میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔

☆ شوریٰ کسی بھی ٹیکنیکل ایشو پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ ماہرین کی ٹیم بنائے اور ان کی رائے کو حتمی تصور کیا جائے یہ ماہرین ظاہر ہے کہ شوریٰ کے ممبران نہیں ہوں گے اور Renowned لوگ ہوں گے۔

☆ جماعت میں علمی اور فکری انحطاط مولانا مودودیؒ کے بعد پیدا ہوگیا ہے اس کو روکنے کے لیے مناسب اقدامات کرنا ضروری ہیں، جس کے لیے مناسب اور مکمل منصوبہ بندی انتہائی ضروری ہے۔ ماہرین اور علماء کی ایسی ٹیم تیار کی جائے جو یہ کام علمی انداز میں سرانجام دے سکیں۔

☆ آئندہ جماعت ہنگامی بنیادوں پر احتجاجوں، جلسوں اور جلوسوں سے مکمل اجتناب کرے اور آئے دن کی ہڑتالوں اور دھرنوں میں وسائل کا ضیاع نہ کرے۔

☆ جماعت میں کڑے احتساب کا عمل ہو۔لیکن یہ کسی کی تحقیر وتذلیل کا باعث نہ بنے۔ماضی میں سودی معاملات پر کئی ارکان کا احتساب کیا گیا اوران کا اخراج کیا گیا لیکن بعد میں یہ روایت ختم ہو گئی اور کچھ دینی تربیت اور اخلاقی انحطاط میں بھی اس کو Personal بنا دیا گیا ہے اوراب اس میں وہ خیر خواہی اور نصیحت کا عنصر باقی نہ رہا۔اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆ ماضی میں جماعت سے کافی سرکردہ لوگ جدا ہو گئے ہیں،ان سب کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ ان میں کوئی خرابی تھی اور جماعت تو بالکل پاک تھی ، یہ ایک نامناسب اور غیر عادلانہ بات ہے۔ان میں سے بہت سے ارکان اور شخصیتیں ایسی ہیں جنہوں نے جماعت کی کمزوریوں اورخامیوں کومحسوس کیا اوراپنے خیال کے مطابق وہ ان عیوب کے ساتھ نہ چل سکے تو بڑے خلوص کے ساتھ جدا ہو گئے ،لیکن دل پر ہاتھ رکھ کر ایسے تمام لوگوں کی تلاش ہماری ذمہ داری ہوگی کہ وہ دوبارہ شامل ہوجائیں۔

☆ جماعتی زندگی کا ایک بنیادی مطالبہ کارکنوں کے مابین باہمی تعلقات کا استوار رہنا ہے۔آج ہمارے بہت سے پرخلوص کارکنان بلکہ ارکان جماعت میں ہوتے ہوئے ،غیر فعال ہو گئے ہیں ، کیا ہمارا فرض نہیں بنتا کہ ان کوسنیں اوران کی غیر فعالیت کوختم کرائیں؟ یہ ہمارے پرخلوص اوردرمند بھائی ہی تو ہیں۔

☆ اسلامی جمعیت طلباء پر پوری توجہ Focus کی جائے ۔ ان نوجوانوں کی علمی، اخلاقی اور ذہنی تربیت کی جائے ،ان کوسرکاری مناصب کے لیے باقاعدہ ٹریننگ دی جائے جیسے CSS،Army ،وغیرہ تا کہ وہ عملی طور پر ان شعبوں میں دین کے لیے کام کرسکیں۔اور ساتھ ہی Talents کو جماعتی کاموں میں فراغت کے بعد مصروف کیا جا سکے۔تاکہ نوجوانی میں دین کے کام کے لیے ان کے اندر جذبۂ خلوص پیدا ہو اور وہ دنیا کی رنگینیوں میں نہ کھو جائیں۔

اسی طرح تعلیمی اداروں اورنظام کے لیے باقاعدہ طور پر منصوبہ بندی کی جائے اورترکی کومثال بنا کر Currcriclum کو Islamise کیا جائے یا اس میں Islamic input ہو

اور تعلیم کے ذریعے تبدیلی کا پروگرام بنایا جائے۔ یہ کام صبر آزما اور مشکل ضرور ہے لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں، اب تک جو بھی ایسے ادارے بنائے گئے ہیں، ایک یا دو کے ماسوا سب کمرشل بنیادوں پر چل رہے ہیں اور یا private Enterprise ہیں جن کا کوئی تعلیمی معیار نہیں ہے۔ ایسے تمام اداروں کو سیاسی مداخلت سے پاک کرنے کے لیے انہیں خود مختاری دینا ہوگی تاکہ انہیں میرٹ کے مطابق چلایا جا سکے۔

☆ دعوت کا کام دو سطح پر ہوتا ہے۔ ایک عوام اور دوسرے خواص

☆ اس خواص میں وہ موثر لوگ شامل ہیں کہ اگر ان پر مناسب حکمتِ عملی سے کام کیا جائے تو زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں لیکن عوام کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

☆ موثر لوگوں کو باقاعدہ ہدف بنا کر ایک یا دو ارکان کی ڈیوٹی لگائی جا سکتی ہے کہ وہ ان کو لٹریچر پڑھائیں اور اس طرح ان کے ساتھ قریبی رابطہ رکھیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جس کا رکن کی ڈیوٹی لگائی جائے گی وہ پہلے خود مطالعہ کرے گا تبھی تو دوسرے کو وہ پمفلٹ یا کتاب دے کر رہنمائی کر سکے گا۔

آخر میں ایک ضروری بات جو امام مالکؒ نے فرمائی تھی کہ اس امت کی اصلاح جس نسخہ سے پہلے کی گئی تھی اسی نسخے سے دوبارہ ہوگی اور اس کے بغیر ممکن نہیں۔ قرآن وسنت کی طرف رجوع ہی ہمارا علاج ہے۔

یہ چند سطور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر لکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری تحریک کو سلامت رکھے اور اس پر اپنے فضل کا سایہ قائم رکھے، اور ہم سب کی دنیا اور آخرت دونوں سنوارے اور ہمیں حق و باطل میں تمیز کی قوت عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَه وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اِجْتِنَابَه.

اگر ان سطور میں کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو یقین جانیے قطعاً میرا منشاء نہیں تھا اور اس کے لیے مَیں معذرت خواہ ہوں۔

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

خلیل الرحمن چشتی

جماعت اسلامی کی شکست، زوال اور عروج کا راستہ

الیکشن ۲۰۱۸ء کے نتائج کے بعد اپنے اور بیگانے سبھی ۱۹۹۳ء ۱۹۷۰ء اور ۲۰۱۳ء کے الیکشنوں کے بعد اٹھنے والی صداؤں کی طرح آوازیں کسنے لگے ہیں۔ ووٹرز کی تعداد تقریباً ساڑھے دس کروڑ تھی۔ اندازاً ساڑھے پانچ کروڑ افراد نے ووٹ دیا۔ جماعت اسلامی (متحدہ مجلس عمل) کا ووٹ پانچ فی صد سے بھی کم تھا۔ ۲۰۱۳ء سے بھی کم۔ پچیس لاکھ افراد نے ایم ایم اے کو ووٹ دیا۔

شکست کے اسباب

شکست کے اسباب کیا تھے؟ اس پر بہت گفتگو کی جا سکتی ہے:

میرے نزدیک سیاسی شکست کی دو کوڑی کی اہمیت نہیں۔ البتہ مجھے یہ فکر ہوتی ہے کہ کہیں نظریاتی، فکری، علمی اور روحانی شکست نہ ہو۔ میری گفتگو کا موضوع دراصل یہی دوسری شکست ہے۔ جس کے بارے میں سوچنا اور غور کرنا ضروری ہے۔ اور ایک طویل منصوبہ بندی ضروری ہے۔ اب روایتی تھوک پالش سے کام نہیں چلے گا۔ انقلابی فیصلے کرنے ہوں گے۔

سیاسی شکست پر عام وخاص نے بہت گفتگو کی ہے۔ اس کو دہرانے کا کیا فائدہ؟ میرے نزدیک اس کے بنیادی اسباب یہ تھے:

۱۔ بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کا اسلامی تحریکوں کے خلاف سخت موقف اور مقامی اسٹیبلشمنٹ اور سیاسی جماعتوں پر دباؤ۔

۲۔ مقامی اسٹیبلشمنٹ کے دانشوروں کا جماعت اور اسلامی تحریک کو پوری طرح نہ سمجھنا اور ان سے کلی طور پر بے تعلق بلکہ معاند ہو جانا۔

۳۔ ضیاء الحق مرحوم کے بعد کے ادوار میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کے طرز حکومت سے عوام کی بیزاری۔

۴۔ فاسق و فاجر عمران خان کا (مقامی اور بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے اور دیگر مقامی اداروں کی مدد سے) پر زور اور جارحانہ طریقے سے، اسلام کے نام پر [illegible] نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ کا نعرہ لگا کر بجا طور پر سماجی عدل وانصاف کی طرف لوگوں کو راغب کرنا (جو یقینا لائق تحسین ہے) اور بالخصوص نوجوانوں اور خواتین کو (خالص اسلامی اقدار واخلاقیات کی بجائے) مغربی اخلاقیات سے اور رقص وموسیقی کے ذریعے بھی متوجہ کرنا۔

عمران خان کی یہ ٹیکنیک نہایت کامیاب رہی کہ وہ جماعت کی تعریف کرتا رہا اور مولانا فضل الرحمن صاحب کی تذلیل۔ اس طرح وہ ایم ایم اے کی صفوں میں دراڑ ڈالنے میں پوری طرح کامیاب ہوگیا۔ پشتو کا محاورہ ہے کہ اگر تمہیں گجر کو مارنا ہو تو اسے نہ چھیڑو، اس کے بھینسے کی پٹائی کرو، گجر خود مر جائے گا۔

۵۔ اسلامی جماعتوں (جمعیت علمائے اسلام، مرکزی جمعیت اہل حدیث اور جماعت اسلامی وغیرہ) کا غریب ومسکین ہونا۔ میڈیا پر تشہیر واشتہارات کے لیے مفلس اور قلاش ہونا۔

٦۔ اسلام پسندوں کے پاس عمران کی طرح کے جارح خطیب کا نہ ہونا، جو اسلام کے منشور اور اپنے اہداف کو عوام کی زبان میں پیش کر سکتے۔

۷۔ اسلام پسندوں کا 'توحید حاکمیت' کے تصور کو پوری طرح نہ سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانے سے قاصر ہونا۔

۸۔ اسلام پسندوں کا قرآن وسنت میں دیئے گئے 'بنیادی حقوق' سے پوری طرح واقف نہ ہونا اور اپنے کارکنوں اور عوام کی صحیح سیاسی تربیت کر نہ سکنا۔

۹۔ عمران کا دینی صفوں میں شگاف ڈالنا اور مولانا فضل الرحمن کو ٹارگٹ بنا کر خصوصا جماعت کے کچے اور ناراض لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا لینا اور اس پردے میں علماء اور دینی شخصیات کی بے توقیری کرنا۔

۱۰۔ عمران خان کے بیانیے کے خلاف، دینی جماعتوں کے پاس کوئی 'مؤثر متبادل اسلامی بیانیہ' تھا ہی نہیں۔ عوام تو عوام ہیں، دینی گھرانوں، علماء، 'مولویوں' اور خود جماعت

اسلامی کے بعض ارکان نے بھی اپنے امیدوار کی حمایت کے بجائے، نہ صرف عمران کی تائید کی بلکہ اس کے کیمپ میں جا کر اس کو جتوانے کے لیے متحرک ہو گئے۔

اپنے اور بیگانے

- کامیابی کے سو باپ ہوتے ہیں، لیکن ناکامی ہمیشہ یتیم ہوتی ہے۔

- بیگانے کہتے ہیں: سیاسی دوکان بند کریں۔ سماجی کام کریں۔ اپنے کہتے ہیں: صوفی بن جائیں۔ اللہ اللہ کریں۔ کچھ کہتے ہیں جماعت کے دو حصے کریں، ایک دعوتی کام کرے گا، دوسرا سیاسی۔ حالانکہ جماعت اسلامی دوئی (Dichotomy) کو مٹانے کے لیے کھڑی کی گئی تھی۔

- اپنوں اور بیگانوں میں کچھ ایسے ہیں، جو جماعت اور تحریک کو سمجھے بغیر اسے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے ہیں۔

- کچھ ایسے دانا دشمن ہیں، جو جماعت اور تحریک کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہیں اور پھر اس کی بھرپور مخالفت بھی کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔

- بیگانوں میں کچھ ایسے ہیں، جو جماعت کو نیک اور دیانت دار لوگوں کے ایک چھوٹے گروپ کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس کا تعارف اسی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اپنوں میں سے کچھ ایسے ہیں، بلکہ اب ان کی کثرت ہے، جو وقت کے ساتھ مزید بڑھتی جارہی ہے، بالخصوص نوجوانوں میں، جو جماعت کو صرف ایک 'سیاسی تحریک' سمجھتے ہیں اور جماعت کی فتح وشکست کو صرف اور صرف الیکشن کی فتح وشکست کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔

شکست اور زوال کے اصل اسباب

میرے نزدیک جماعت اور تحریک کی سیاسی شکست اور اس کا زوال زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے، بلکہ اس کا داخلی محاذ پر انحطاط سے دوچار ہونا بے حد تشویش ناک ہے۔ یہاں چند امور کی نشان دہی کی جارہی ہے:

ا۔ جماعت کے رکن کا 'خالص سیاسی کارکن' بن جانا اور اپنے آپ کو قرآن وسنت کے داعی اور مبلغ کے منصب سے کنارہ کش کر لینا۔ میں اسے تحریک کا سب سے بڑا زوال سمجھتا ہوں۔ یہ زوال ۱۹۹۰ء کے بعد برق رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ ہفتہ وار درس قرآن اور درس حدیث کی اہمیت اور باقاعدگی گھٹتی گئی۔ نصاب رکنیت کے وجوب کو استحباب سے بدلا گیا۔ نصاب میں حالات وزمانہ کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب تبدیلیوں سے گریز کیا گیا۔

۲۔ دستور جماعت سے روگردانی۔ حلف رکنیت کے بارے میں غیر سنجیدگی۔ عقیدۂ جماعت اور طریقۂ کار سے بے اعتنائی جو حلف کے بعد (اللہ نہ کرے) اللہ سے بے وفائی اور بغاوت کے درجے تک پہنچ سکتی ہے۔ شعوری حلف کی بجائے محض ایک رسمی اور کاغذی کاروائی بن سکتی ہے، جس طرح پاکستان کے کرپٹ حکمران حلف اٹھا کر اپنے حلف اور دستور پاکستان کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں۔

۳۔ جامع توحید کے بارے میں تساہل، جو جماعت کے دستور اور لٹریچر میں موجود ہے۔

۴۔ منصب رسالت کے بارے میں لاعلمی اور سنت کے بارے میں تساہل۔ قیادت کا امہات الکتب صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی طرف عدم رجحان۔ اتباع سنت کے سلسلے میں غیر سنجیدگی۔ فقہ کے بنیادی اصولوں سے ناواقفیت جو فقہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی میں مشترک ہیں۔

۵۔ توحید حاکمیت

کارکنان اور قیادت کی 'توحید حاکمیت' سے لاعلمی اور قرآن وسنت میں موجود اس کے علمی دلائل سے عدم واقفیت۔ یہی وہ اہم چیز ہے جو جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کو دیوبندیوں، بریلویوں اور اہل حدیث سلفیوں سے ممتاز اور ممیز کرتی ہے۔

۶۔ عدل اجتماعی کے جامع تصور سے لاعلمی

اسلام کے 'سیاسی، سماجی اور معاشی عدل' کے تصور سے پیشتر ارکان و کارکنان کی لاعلمی اور کارِ رسالت کے ایک اہم جزء [illegible] لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم' اور [illegible] کے جامع ادراک سے محرومی۔

۷۔ اسلامی طرز حکومت سے لاعلمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے اربعہ راشدین ومہدیین کے طرز حکومت سے لاعلمی، جو اسلامی تحریک کے لیے ایک نمونہ اور ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۸۔ علمی زوال

قیادت کی اکثریت (الا ما شاءاللہ) وحی الٰہی پر مشتمل اسلام کے دو بنیادی مآخذ (قرآن وسنت) اوراس کی زبان سے لاعلم ہوتی جارہی ہے۔شوریٰ میں علماء کی مقدار اور معیار میں کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔

جب قاضی حسین احمد مرحوم نے مولانا گوہر رحمن کو صوبہ سرحد کی امارت سے معزول کرکے پروفیسر ابراہیم کو مقرر کیا اور نو (۹) نائب امراء میں مولانا گوہر رحمن جیسے بڑے عالم کو شامل نہیں کیا تو یہ بات واضح ہوگئی کہ اب مستقبل میں 'اسلامی تحریک' کی قیادت غیر علماء ہی کے پاس رہے گی۔علماء محض دم چھلے کی حیثیت سے تحریک میں شامل رہیں گے، جب کہ جماعت کا دستور صاف کہتا ہے کہ ہم ہر فیصلہ کرنے سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ اس معاملے میں قرآن و سنت کی ہدایات کیا ہیں اور سیاسی قیادت ہی فیصلہ کن قوت کی حامل ہوگی۔

ایک نکتہ سمجھ لیجیے۔مولانا مودودی جس طرح دینی اور دنیاوی علوم کے جامع تھے، جماعت کی قیادت اسی طرح کی جامع ہونی چاہیے، ورنہ خالص دینی علوم اور خالص دنیاوی تعلیم کا حامل تحریک اسلامی کی قیادت کا اہل نہیں ہوسکتا۔ ورنہ اس کے نتائج آپ دیکھ رہے ہیں۔ اب سوچنے والے کم ہیں اور لکھنے والے بھی۔

۹۔ فکری زوال

فکری زوال یہ ہے کہ لوگ سیاست اور سیاسی شکست کے علاوہ کچھ غور ہی نہیں کرتے۔ جس کی طرف اس تحریر میں اشارات موجود ہیں۔

۱۰۔ عملی تربیت سے بے اعتنائی

اسلامی تربیت نیک لوگوں کی صحبت سے ہوتی ہے۔ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کا حکم اسی

لیے ہے۔کوئی ہو جو غیبتوں پر ٹوک دے۔کوئی ہو جو بتائے کہ نماز تم نے اطمینان سے نہیں پڑھی۔کوئی ہو جو بتائے آپ نے سجدہ صحیح نہیں کیا۔کہنی تک ہاتھ زمین پر کیوں پھیلائے؟ نماز کے بعد کچھ دیر بیٹھ کے مسنون اذکار کیوں نہیں کیے؟

۱۱۔ شرعی عقل و استدلال سے گریز، جس کے نتیجے میں لوگ اعتزال اور غامدیت کی طرف رجوع کر رہے ہیں، جو سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام کے لیے سرگرم ہیں۔

۱۲۔ روحانی تربیت سے گریز

'نبوی روحانیت' کی فروغ کے بجائے روایتی تصوف کے احیاء کی کوشش، مولانا مودودی کے منہج سے انحراف۔ یہ تبدیلی ترجمان القرآن سے نعیم صدیقی صاحب کی علیحدگی اور خرم جاہ مراد صاحب کے مدیر مقرر ہونے سے رونما ہوئی۔ارکان وکارکنان کی روحانیت میں تو ایک ماشے کا بھی اضافہ نہ ہوسکا، لیکن بعض نے ذکر کے غیر مسنون طریقے اور بعض نے مزاروں پر چادر چڑھانے کی بدعت اختیار کر لی۔مولانا مودودی اس قسم کی حماقتوں سے کوسوں دور تھے۔قرآن مجید کے مخصوص حصوں اور مسنون دعاؤں کی تحفیظ سے ارکان و کارکنان کو روحانی طور پر بلند کیا جا سکتا تھا، لیکن اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

نتائج

۱۔ جمعیت کے عظیم ادارے کا زوال

اسلامی جمعیت طلبہ ایک عظیم ادارہ ہے۔مجھے اس سے محبت ہے۔یہ نئی نسل کو اسلام سے وابستہ رکھتا ہے۔یہ مستقل طور پر جماعت کو افرادی قوت مہیا کرتا ہے۔اس نے دنیا کو پروفیسر خورشید احمد اور ڈاکٹر اسرار احمد جیسے افراد دیے ہیں۔آج خورشید کیوں طلوع نہیں ہوتے؟ آج اسرار طشت از بام کیوں نہیں ہوتے؟ اس لیے کہ ان کے سامنے بڑے لوگ تھے۔ان کے عزائم بلند تھے۔ان کے سامنے علم کا لامتناہی سمندر تھا۔عجلت پسندوں نے جمعیت کو دانستہ یا نادانستہ کمزور کیا۔اسکے مقابلے میں شباب ملی اور پاسبان کی سرپرستی کی گئی، یہی غیر تربیت یافتہ تنظیمیں آگے چل کر عمران خان کا ہراول دستہ بنیں۔اسلامی تحریک کو زوال سے بچانے کا واحد

راستہ یہ ہے کہ تحریکی افراد اپنے 50 فی صد وسائل جمعیت کو دیں۔ الیکشن میں ضمانتیں نہ گنوائیں۔ یہ وسائل کا ضیاع ہے۔نئی نسل کو سنبھالیے۔طویل المیعاد منصوبہ بندی کیجیے۔یہیں سے بڑے لوگ پیدا ہوں گے۔ان ہی نوجوانوں سے امید ہے ۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ہمیں چن چن کر ایسے ذہین نوجوانوں کو منتخب کرنا ہوگا ، جو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوتے رہے ہیں ۔انہیں تکمیل علم تک وظائف دے کر کفالت کرنی ہوگی۔ ہر ضلع میں ۱۳ سے ۱۵ سال کے ذہین لڑکوں کا انتخاب کرنا ہوگا۔ پیسہ یہاں لگایئے۔

انہیں دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ کر کے سول سروس ،فوج ، پولیس ۔عدلیہ، ادب ، صحافت ، اقتصاد ، قانون اور دیگر شعبہ جات میں پی ایچ ڈی کرانا ہوگا۔یہی لوگ مستقبل میں تحریک کے قائد ہوں گے۔ان کی اسلامی تربیت کرنی ہوگی۔ان کے کردار کو سنوارنا ہوگا۔ یہ ہے وہ طویل المیعاد منصوبہ جس کی روشنی میں پاکستان میں نفاذ اسلام کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔ سیاسی جدوجہد ضروری ہے،لیکن محض سیاسی جدوجہد سے اسلامی انقلاب برپا نہیں ہوسکتا۔

۲۔ ارکان جماعت کے عظیم ادارے کا زوال

قیام پاکستان کے بعد ارکان کی تعداد تین سو سے کم تھی۔آج تیس ہزار سے زیادہ ہے۔ ہر رکن اپنی جگہ ایک انجمن تھا۔ایک شمع ،جس کے اطراف پروانے تھے۔عجلت پسندوں نے اس ادارے کو کمزور کیا۔ ہر رکن خود قرآن وسنت کا درس دیتا تھا، یا اس کا گھر دعوت کا مرکز تھا۔ ہر رکن کے پاس ایک اچھی خاصی لائبریری ہوتی ۔ وہ اسلام کا مجسم داعی تھا۔ان کی خواتین ، ان کے بچے سبھی اسلامی رنگ میں ڈھل جاتے تھے۔ پھر پی پی اور مسلم لیگ کی طرح عوامی بھرتیاں ہونے لگیں۔ان میں داعی اور مبلغ کم تھے۔محض سیاسی کارکن تھے۔ دستور کو سمجھے بغیر حلف لینے لگے۔ارکان کے حلف نامے میں تین (۳) دفعہ'اچھی طرح' کا ذکر ہے۔

پھر اسی انحطاط نے 'باگ ڈور'ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دی جو" بھاگ دوڑ" کرنے والے تھے۔اب دل اور دماغ کے بجائے ہاتھ اور پاؤں کے ہاتھ میں فیصلے تھے۔ یہ تبدیلی

یکا یک نہیں آئی۔ اس زوال کا آغاز ۱۹۸۷ء کے بعد بہت تیزی سے ہونے لگا۔ اور اب ۳۱ سال بعد ۲۰۱۸ء میں آپ خود ملاحظہ فرماتے ہیں:

لٹریچر سے لگاؤ نہیں۔ قرآن وحدیث کا باقاعدہ روزانہ مطالعہ نہیں۔ ہفتہ وار درس میں شرکت نہیں۔ بس سیاسی جلسے میں شرکت اہمیت حاصل کر گئی۔ صوت حمیر پر مشتمل نعرے ہی جذبات کو مہمیز دینے کے لیے کافی تھے۔ علم و استدلال پر جذباتیت کو ترجیح تھی۔ کچھ مفاد پرست کسی طرح جماعت کے رکن بن کر جماعت کے ارکان کو مالی نقصان پہنچانے لگے۔ الیکشن میں خود امیدوار بننے کو عیب سمجھا جاتا تھا اور اس کا اخراج ہوجاتا تھا۔ اب علی الاعلان ہوس انگڑائیاں لینے لگی۔

الیکٹیبلز (Electables)اور ATM کی اہمیت بڑھنے لگی۔ گروپ بندیاں عام ہونے لگیں۔ بعض بغاوت کر کے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑنے لگے۔ ب شوہر ظلم کرتا ہے تو بیوی باغی ہوجاتی ہے۔ اس کے ردعمل پر وہ خود طلاق دے دیتا ہے یا پھر بیوی خود خلع لے لیتی ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی میں بچے پس جاتے ہیں۔ امیر اور مامور کا یہ تعلق صرف انتظامی نہیں، بلکہ ایمانی، قلبی اور روحانی ہوتا ہے۔

۳۔ شوریٰ کے اداروں کا زوال

ارکان کا زوال خود بخود شوری کے زوال کی صورت میں رونما ہوا۔ اب صاحب الرائے ہی نہیں، غیر صاحب الرائے بھی رائے دینے لگے۔ وہ لوگ رائے دینے لگے، جو صرف الیکشن کی سیاست کے تجربے کار تھے۔ ان کے نزدیک جماعت کے مجموعی نصب العین اور کردار سازی کی اہمیت بہت کم تھی۔ نہ ان کا مطالعہ تھا اور نہ ان کے فہم میں گہرائی۔ ہر ضلع کا امیر، جو خود الیکشن میں امیدوار تھا، شوری کا لازماً رکن بن گیا۔ اب شوری کا اصل ایجنڈا امیدوار کی سرگرمیوں کے اطراف ہی گھومتا تھا۔ امیر ضلع کا خود امیدوار بن جانا نہ صرف ضلع کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا بلکہ شوری کے لیے بھی۔ امیر ضلع کی ترجیح اول خود اس کا ضلع سے پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی کے لیے انتخاب تھا۔ دعوت، تربیت وغیرہ سب ثانوی حیثیت اختیار کر گئیں۔

۴۔ قیادت کا زوال

اکثر جگہ اب قیادت کا معیار یہ تھا کہ وہ علمی، فکری، اخلاقی اور روحانی طور پر جیسا بھی ہو قائد وہ تھا، جو پیسہ لگا سکتا ہو، الیکشن لڑ سکتا ہو۔ اب یہ نئی قیادت ارکان و کارکنان کی مربی اور آئیڈیل بھی تھی۔ نیک اور شائستہ لوگ پہلے مزاحمت کرتے رہے لیکن پھر بتدریج حیرت زدہ خاموش تماشائی بنتے گئے۔

۵۔ نئی ترجیحات کے تعین سے گریز اور پرانی ڈگر پر بدستور قائم رہنا۔کلرکوں کا کام دفتری کاغذات کو درست رکھنا ہوتا ہے۔ یہ منصوبہ بندی کرنے لگے۔ پچھلے سال کا منصوبہ لے کر اس میں پانچ دس فی صد اضافہ کر کے ہر سال نیا منصوبہ بنایا جانے لگا اور خوبصورت سے خوبصورت کاغذ پر چھاپا جانے لگا۔لکیر کے فقیر اور کیا کر سکتے ہیں؟ یہ ہے ہمارے گزشتہ پینتیس چالیس سال کے زوال کی داستان!

عروج کا راستہ

عروج کے بعد زوال ہے اور زوال کے بعد عروج ۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

امام مالکؒ نے پتے کی بات کہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس امت کے آخر کی اصلاح بالکل اسی طرح ہوگی جس طرح پہلے ہوئی تھی۔ جماعت اسلامی کی تحریک کی اصلاح بھی بالکل اسی طرح ہوگی، جس طرح پہلے اس کی بنیاد قائم کی گئی تھی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم نئے سرے سے معاملات کا جائزہ لیں۔

اب پرانی دوا بے اثر ہوگی۔ ایک نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ ایک نئے لائحۂ عمل کی ضرورت ہے۔ اب پوری قیادت کو بدل کر نئی قیادت لانی ہوگی۔ نوجوان قیادت۔ یہی عروج کا راستہ ہے۔ نوجوانوں کو ہماری ترجیح کا مرکز ہونا چاہیے۔ باقی کام ثانوی حیثیت کے حامل ہوں گے۔

نئے امیر کا انتخاب

امیر کے انتخاب میں مروجہ طریق کار کو بدلنا ہوگا۔ تین ناموں کی بجائے دس بارہ نام

دیے جائیں۔ ہر صوبے سے تین چار نئے نام۔ نامزد کردہ امیدواروں سے پوچھا جائے کہ وہ اگر منتخب ہو جائیں تو پہلے سال، دوسرے سال اور تیسرے سال کیا اہداف حاصل کریں گے؟ اب امیر کا انتخاب کارکردگی پر ہونا چاہیے ۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

امیر خود انتخاب نہیں لڑے گا۔ اس کی ہیبت اور رعب ہوگا۔ سیاسی لوگ اس سے آ کر ملیں گے۔ وہ بادشاہ گر ہوگا۔ وہ محور ہوگا۔ مرکز فکر و رشد و ہدایت ہوگا۔ وہ نہ سینٹ میں جائے گا اور نہ عدالتوں کے چکر لگائے گا۔

شوریٰ کی نئی ماہیت

شوریٰ کی ماہیت کو بھی بدلنا ہوگا۔ اس میں علماء اور فقہاء کے لیے، مفکرین کے لیے، اقتصادی ماہرین کے لیے، قانونی اور دستوری ماہرین کے لیے، عسکری ماہرین کے لیے، مینجمنٹ کے ماہرین کے لیے نشستیں مخصوص کرنا ہوں گی۔

ارکان

- ہر رکن کو قرآن و سنت کا داعی اور مبلغ بنانا ہوگا۔ اخوان کی طرح ہر رکن کو مغرب تا عشاء مسجد میں بیٹھ کر دعوت اور تربیت کے لیے تیار کرنا ہوگا۔

- پاکستان کے تمام ارکان کا اور جمعیت کے نوجوانوں کا فرداً فرداً جائزہ لینا ہوگا کہ کون کس قابل ہے؟ کس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے؟ کس میں کیا صلاحیت ہے؟ کن کن کی صلاحیتوں کو کن کن امور میں ترقی دی جا سکتی ہے۔ یہاں صرف سیاسی صلاحیت مقصود نہیں۔

- ہر ضلع کی الگ الگ منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔ منصوبہ بندی میں کلرکوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. اللہ کرے یہ تحریر جماعت کو ایک نیا لائحۂ عمل مرتب کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ اللّٰھم انی اعوذبك من شرور نفسی و من سیآت اعمالنا.

کیا سراج الحق صاحب کو استعفیٰ دینا چاہیے؟

دستوری اور قانونی اعتبار سے تو سراج الحق صاحب پورے پانچ سال کے لیے منتخب ہوئے ہیں ۔ اس مدت کی تکمیل تک اس عہدے پر قائم رہنا ان کا استحقاق ہے لیکن اعلیٰ اخلاقیات کا تقاضا یہی ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں اور کسی اور کو قائم مقام امیر مقرر کر دیں۔ ویسے بھی دو چار ماہ بعد نئے امیر کا انتخاب ہونے والا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے۔ یہی مشورہ میں نے اکیلے میں قاضی حسین احمد صاحب مرحوم کو اسلامک فرنٹ کی شکست پر ۱۹۹۳ء میں دیا تھا۔ جس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ میں نے اس کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پھر انہوں نے واقعی استعفیٰ دے دیا اور پھر دوبارہ منتخب ہوئے تھے۔ یہ ایک اچھی روایت ہے جس کا تسلسل جاری رہنا چاہیے۔ یہ بے نفسی کی بھی دلیل بن سکتی ہے تاہم سراج الحق صاحب کو مندرجہ سوالوں کا جواب بھی دینا ہے اور کارکنان ہی کو نہیں ارکان کو بھی مطمئن کرنا ہے:

۱۔ ایم ایم اے کو بحال کرنے کا خیال آپ کو ۲۰۱۳ء ہی سے تھا۔ پھر آپ نے ساڑھے چار سال کیوں لگائے اور انتخابات تک اس کی بحالی کو مؤخر کیوں کیا؟

۲۔ جب آپ ایم ایم اے کو بحال کرنا ہی چاہتے تھے تو عمران خان کی وزارتوں کی بھیک کیوں لی؟

۳۔ آخری وقت تک آپ کے وزراء، وزارتوں سے چمٹے کیوں رہے؟

۴۔ آپ نے وزارتیں ہی لینی تھیں تو عمران کے ساتھ مفاہمت کا رویہ کیوں اختیار نہیں کیا؟

۵۔ یاد رہے میں نے میڈیا پر آپ کے فیصلے کی تائید کی کہ آپ نے دونوں کے ساتھ کام کرنے کے تجربے کے بعد ایم ایم اے کی تائید کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ عمرانی حکومت پر مولانا کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔

۶۔ آپ نے کھل کر عوام کو کیوں نہیں بتایا کہ یہ اور یہ وجوہات ہیں جن کے سبب ہم نے ایم ایم اے کو ترجیح دی؟

۷۔ آپ کا بیانیہ کمزور اور غیر مؤثر رہا جسے عوام نے مسترد کر دیا۔

۸۔ کیا آپ کو گمنام لوگوں نے الیکشن سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آپ کو ایک سیٹ سے زیادہ نہیں دی جائے گی اور کراچی دوبارہ آپ کو نہیں دیا جائے گا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو آپ نے ارکان اور عوام کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟

۹۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ آپ خود کو امیر جماعت اسلامی کے بجائے 'امیر مسلمانان عالم' اور 'امیر مسلمانانِ پاکستان' سمجھنے لگے تھے؟ یا کچھ لوگوں نے آپ کو یہی باور کرایا تھا؟

۱۰۔ آپ کو اپنی جماعت، اپنے ارکان اور اپنے نصب العین سے زیادہ 'جھوٹی توقعات' کی بے جا فکر تھی؟

۱۱۔ آپ ۲۰۱۵ء سے یہ جھوٹی اور سراسر مبالغے پر مبنی بات جمعیت طلبہ کے نیم پختہ نوجوانوں کو آخر کیوں سمجھا رہے تھے کہ ۲۰۱۸ء میں ہماری حکومت ہوگی جب کہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ پورے ملک میں آپ کے ووٹوں کی شرح کیا ہے؟ دو سیٹیں دیر سے اور ایک سیٹ بُنیر سے لے کر آپ کس خیالی دنیا میں مبتلا تھے یا مبتلا کر دیے گئے تھے جب کہ آپ کی اس خیالی گفتگو پر حقیقت پسند افراد آنسو بہا رہے تھے۔

۱۲۔ آپ نے اپنے پیش رو کی طرح ضمانت ضبط کرانے والوں کو کیوں ٹکٹ دیے؟ جب کہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ دوبارہ بھی ضمانت ضبط ہوگی! اس طرح آپ نے جماعت کے متوسط طبقے کو کنگال کیا، مفلس بنایا اور جماعت کی رقم کا غلط استعمال کیا۔ کیا آپ کو اس پر کوئی احساسِ ندامت ہے؟

کیا جماعت نے مرکزی طور پر ۳۵ کروڑ سے زیادہ اور مقامی اور انفرادی طور پر پورے ملک میں ایک ارب روپے سے زیادہ کے اخراجات نہیں کیے؟ حالانکہ بار بار یاددہانی کرائی گئی کہ صرف ان کو ٹکٹ دیا جائے جن کے جیتنے کے غالب امکانات ہوں یا جو اگلے الکشن میں جیت سکتے ہوں اور جن کے بارے میں سروے کے نتائج حوصلہ افزاء ہوں۔ کیا یہ جماعتی وسائل کا غلط استعمال نہیں ہے؟ کیا یہ رقم نوجوانوں کی تربیت پر خرچ نہیں کی جاسکتی تھی؟

عمران خان جیسا شخص کہتا ہے کہ سڑکوں اور میٹرو کی بجائے رقم انسانوں پر خرچ کرنا

چاہیے لیکن ایک نظریاتی جماعت کے امیر ہوتے ہوئے آپ جماعت کی رقم ضمانتیں ضبط کرانے میں خرچ کر دیتے ہیں۔کون آپ کو اس کام کے لیے مجبور کرتا ہے؟

۱۳۔ ضمنی الیکشن میں لاہور کے حلقے ۱۳۰ سے آپ نے کیوں ٹکٹ دیا جب کہ ہمارے امیدوار نے صرف ۵۹۲ ووٹ حاصل کیے؟ یہی کام آپ نے جولائی ۲۰۱۸ء کے عام انتخابات میں کیوں انجام دیا؟

۱۴۔کیا آپ اور آپ کی مجلس عاملہ اس پر غور کر سکتی ہے کہ خود منصورہ سے جماعت کے امیدواروں کو کوئی ووٹ نہیں دیتا؟ خود ارکانِ جماعت اور ان کے اہل خانہ جماعت کو ووٹ نہیں دیتے۔

۱۵۔ کیا آپ کو اپنے گھر کی زیادہ فکر ہے یا دوسروں کی؟

۱۶۔ کیا امیر جماعت کسی اور شخص کو سینٹ میں نہیں بھیج سکتا جو اسلامی قانون کا ماہر ہو اور جو اسلامی قانون سازی میں موثر کردار ادا کر سکے۔آپ اپنے مداحوں کی باتوں میں آ کر سینٹ میں کیوں گئے؟

۱۷۔ کیا امیر جماعت کا یہ کام ہے کہ وہ روزانہ صبح سویرے ۹ بجے سے پہلے عدالت میں حاضری دیتا رہے اور اکیلے نواز شریف کو برطرف کرا کے دوسرے لوگوں کے بارے میں عدالت نہ جائے؟ کیا یہ کام کسی اور مناسب شخص کو نہیں دیا جا سکتا تھا؟

آپ کے کارکنان اور ارکان آپ کی عدالت میں پیشیوں کے سبب نواز شریف سے شدید نفرت کرنے لگے تھے اور دوسری طرف عمران خان کا بیانیہ مضبوط ہو رہا تھا۔پھر آپ نے مجلس عمل کی حمایت کا اعلان کیا۔اتنی تاخیر ہوئی کہ خود آپ کے اپنے لوگ اس اچانک تبدیلی کے لیے تیار نہیں تھے۔ان انتخابات میں مولانا خود تو ہار گئے لیکن ان کی جماعت کو اچھی خاصی سیٹیں مل گئیں۔اصل نقصان تو آپ کی جماعت کا ہوا۔

۱۸۔ آپ نے اپنے ساڑھے چار سالہ دورِ امارت میں دستور میں موجود عقیدے اور طریقۂ کار کے سلسلے میں ارکان اور ارکان کے اہل خانہ کی تعلیم و تربیت پر کیا توجہ دی؟ جماعت کی دعوت کی توسیع میں آپ کو کیا کامیابی حاصل ہوئی؟

۱۹۔ اس وقت جماعت کے ۳۵ فیصد سے زیادہ ارکان غیر فعال کیوں ہیں؟ اس سلسلے میں آپ نے کیا کیا؟

۲۰۔ آپ کے بارے میں یہ شکایت ہم جیسے عام لوگوں ہی کو نہیں بلکہ پرانے بزرگوں اور کبار علماء کو بھی ہے کہ آپ ان کے کسی خط کا جواب نہیں دیتے۔ ظاہر ہے جب آپ روزانہ عدالت عالیہ کے چکر لگائیں اور سینٹ میں حاضری بھی دیں تو آپ کے پاس پڑھنے کے لیے وقت کیسے نکل سکتا ہے؟ پھر جواب کیسے دیا جا سکتا ہے؟

۲۱۔ نظریاتی لوگ تو ہزار شکستوں کے بعد بھی جماعت سے جڑے رہیں گے لیکن نوجوان سیاسی شکست سے بہت جلد افسردہ و مایوس اور تحریک اور اس کی قیادت سے بددل ہو جاتے ہیں۔ امید ہے کہ اگر یہ گزارشات آپ تک پہنچیں گی تو آپ ان پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

اگلے انتخاب امیر کے لیے شوریٰ کو تین (۳) نہیں، دس (۱۰) نام دینے چاہئیں، ہر صوبے سے۔ ہر تجویز کردہ امیدوار بشمول آپ کے ارکان کو ویڈیو کے ذریعے اور خود اپنی تحریر کے ذریعے یہ بتائیں کہ اگر وہ منتخب ہو جائیں تو ایک سال میں ان کا ہدف کیا ہوگا؟ تین سالوں کے لیے کیا اہداف ہوں گے؟ پانچ سال کے لیے کیا اہداف ہوں گے؟ اب ۲۰۱۸ء میں جماعت کو اور اس کی مرکزی قیادت کو خود بھی روایتی نہیں بلکہ اپنے اندر خود کڑا احتساب کرنا ہوگا جس کی روایت خود جماعت نے سب سے پہلے ملک کو دی ہے۔

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء　　محمد معاویہ

جماعت اسلامی کی شکست - تاریخ، وجوہات اور حل[۱]

اسلام پسند دوستو! تمہیں یاد تو ہوگا وہ سب ذرا ذرا کُچھ سفید رِیش بزرگ جو اپنی مستقبل بین نگاہوں سے تمہاری اِسی زبوں حالی کو دیکھتے اور تمہیں جھنجھوڑنے کی اپنی مقدُور بھر کوشش کرتے اور یہ سمجھاتے سمجھاتے دُنیا سے رُخصت ہوئے کہ:

ہجوم نہیں قابلیت۔ عددی اکثریت نہیں، صلاحیت۔ فقط نعرے نہیں، قُرآن و سنت، شارٹ کٹ نہیں، ایک لمبی انتھک جدوجہد۔

مگر ہماری پیشانیاں یہ سب سُن کر نہ صرف شکن آلود ہُوئیں بلکہ ہم اُن کی آہ وفغاں کو نظر انداز کرتے ہوئے لپکے بیلٹ بکسوں کی طرف کہ ہمارے تیئں اسلامی انقلاب کو یہیں کہیں سے برآمد ہونا تھا، جو نہ ہونا تھا، نہ ہُوا اور نہ ہو سکے گا۔ نامُمکن تو نہیں یہ سب؛ لیکن اس کے لیے درکار زادِ راہ ہَمراہ نہیں، بصیرت بھی نہیں دستیاب، جبکہ صالحیت اور صلاحیت بھی نہ ہیں ہمرکاب۔ منزل تو پہلے ہی دُور کہیں بہت دُور کھو آئے ہو، پھر یہ کِس کی تلاش میں بگٹٹ دوڑے چلے جاتے ہو؛ یہ جو دھما چوکڑی اور اُچھل کُود ہے نا یہ سب لاحاصل ہے، فقط دِل کے بہلانے کا ساماں ہے یا لہُو گرم رکھنے کا اِک بہانہ۔

ابھی بھی وقت ہے ٹھہر جاؤ، سکوت اختیار کرو کُچھ دیر، ٹھنڈی سانس لو، جذبات کی دُنیا سے نکلو اور سوچو کہ منزل کب، کہاں اور کیسے کھو گئی؟

آؤ کُچھ پگڈنڈیوں پر کُچھ اُونچے نیچے رَستوں پر تھوڑی دُور چلتے ہیں متاعِ گُم کردہ کی تلاش میں، زیادہ دُور نہیں بس ایسے ہی جنرل ایوب خان کے دور سے اپنے آج کی طرف چھل قدمی کرتے واپس آتے ہیں۔

فیلڈ مارشل ایوب خان اور مادرِ مِلّت مُحترمہ فاطمہ جناح کی کشمکش، بڑی بُرائی اور چھوٹی بُرائی کے فلسفہ کی تخلیق، عورت کی حُکمرانی جائز، بھٹو کی مُخالفت جبکہ جنرل ضیاء الحق کی حمایت، رُوس کے خلاف افغان جہاد میں شرکت، اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت؛ مرکز میں مزاحمت

صُوبہ پنجاب میں وزارت، نواز شریف اور بینظیر بھٹو کی کشمکش، عورت کی حکمرانی ناجائز، پاکستان اسلامک فرنٹ کی تشکیل، بینظیر بھٹو اور نواز شریف کی حکومتوں کے خلاف کامیاب دھرنے، کرپٹ حکومتوں کا یکے بعد دیگرے خاتمہ، دھرنوں کے بعد انتخابات کا بائیکاٹ، ملّی یکجہتی کونسل، جنرل مُشرف کے دور میں افغانستان میں نیٹو فورسز کی دراندازی اور ہمارا کمزور ردِعمل، خیبر پی کے میں متحدہ مجلسِ عمل کی کمزور حکومت، کراچی میں انتخابات کے روز بائیکاٹ، ضمنی انتخابات میں شرکت، بلدیاتی الیکشنز میں ہر یُونین کونسل میں مدِ مُقابل الگ حق اور الگ باطل، اور اب سابق دورِ حکومت میں مرکز اور خیبر پی کے میں بہترین پارلیمانی کارکرگی کے باوجود پانچ سال پُرانی کیلکولیشنز کی بُنیاد پر مُتحدہ مجلسِ عمل کی دوبارہ بحالی اور انتخابات میں شرکت۔ بس یہیں کہیں اِنہی پگڈنڈیوں پر، اِنہی راہوں میں دستار ہماری چھن گئی ہے!

کون سا فیصلہ صحیح تھا اور کون سا غلط، میں نہ مانوں والی بحث مقصود نہیں؛ ہاں مگر احساسِ زیاں ضروری ہے؛ اگر یہ بھی نہیں رہا تو پھر لگے رہیں یُونہی ایک صدی اور۔ ۱۹۷۰ء سے اب تک ہم انتخابی سیاست میں ایک اِنچ آگے نہیں بڑھ سکے بلکہ مُلکی آبادی اور ووٹرز کی تعداد کے تناسب سے موازنہ کریں تو موجودہ کیفیت کو خسارے سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کون سا فیصلہ صحیح تھا اور کون سا غلط، میں نہ مانوں والی بحث مقصود نہیں؛ ہاں مگر احساسِ زیاں ضروری ہے؛ اگر یہ بھی نہیں رہا تو پھر لگے رہیں یُونہی ایک صدی اور۔ اسلامی انقلاب کی جانب پیشقدمی اور انتخابی سیاست میں کامیابی کے لیے جہاں عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے والی بیدار مغز قیادت کی ضرورت ہوتی ہے وہیں نظریاتی طور پر یکسو اور مستعد کارکنان بھی دینی سیاسی جماعتوں کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ لیکن انتخابی سیاست کے تناظر میں چُونکہ اہمیت نمبر گیم کی ہے لہٰذا اس ٹارگٹ کے حصول کے لیے سیکولر سیاسی پارٹیوں کے ہاں ہر طرح کے ہتھکنڈے اختیار کرنا نہ صرف جائز تصور کیا جاتا ہے بلکہ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو ہٹانے کے لیے پیسے، دھونس دھمکی اور دھاندلی جیسے حربے اختیار بھی کیے جاتے ہیں۔ اِدھر ریاست کے طاقتور اداروں کا ریاستی اُمور اپنی مرضی کے مُطابق چلانے کی خواہش اس بات کی مُتقاضی ہے کہ پبلک پاپولر پارٹیوں یا ان کی لیڈر شِپ کو گود لے لیا جائے اور یُوں پیسے، طاقت اور اشرافیہ کا ایک ایسا گٹھ جوڑ وجود میں آجاتا ہے جس سے نبرد آزما ہونا دینی جماعتوں کے لیے ایک چیلنج سے کم نہیں۔

دینی جماعتیں اس نظام کی لپیٹ میں تب آئیں جب ۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی کو اَینٹی

سٹیٹ پارٹی ڈکلیئر کر کے اُس کے مُقابل دائیں بازو کی ۹ سیاسی پارٹیوں بشمول دینی جماعتوں پر مُشتمل اسلامی جمہوری اتحاد کے نام سے ایک گرینڈ الائنس تشکیل دیا گیا، اس اتحاد کو پہلے ۱۹۸۸ء میں صُوبہ پنجاب میں اور بعدازاں ۱۹۹۰ء میں مرکز میں حکومت بنانے کا موقع مِلا اور یُوں میاں مُحمد نواز شریف وزیرِاعظم پاکستان بننے میں کامیاب ہوگئے۔ نواز شریف نے حکومت ملنے کے بعد دینی جماعتوں سے بے اعتنائی برتی۔ نتیجتاً یہ اتحاد ۱۹۹۰ء میں حکومت بننے کے فوراً بعد ہی ختم ہوگیا۔

۱۹۹۳ء میں نواز شریف کی شخصیت کا سَحر سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ دینی جماعتیں جب انتخابات میں اُتریں تو اُنہیں انتخابی نتائج سے خبر ہوئی کہ اُن کا ووٹر تو نواز شریف کے ساتھ رہ گیا ہے اور وہ تہی دَست۔ بس اُس کے بعد سے ووٹرز کی تلاش میں بھاگ بھاگ کر ہم اَدھ مُوئے ہو چُکے اور بضد ہیں کہ ووٹ تو لے کر ہی چھوڑیں گے۔

دائیں بازو کے ووٹرز کی اکثریت ایک عرصے تک نواز شریف کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی رہی۔ جب نواز شریف سٹیٹ آرکیٹیکٹس کے ساتھ اپنے سِینگ بار بار پھنسانے سے باز نہ آئے تو اُس کا تِیا پانچا کرنے کی ٹھان لی گئی۔ اب رہ گیا ووٹ بنک تو اس ووٹر کو نواز شریف سے مُتنفر کرنے کے لیے کُچھ مذہبی جنونی میدان میں اُتارے گئے۔ تحریک لبیک پاکستان کی لانچنگ بھی اِسی سٹریٹیجی کا حصہ تھی۔ دائیں بازُو کا ووٹر ذہنی طور پر جُونہی مُنتشر ہُوا اُن کو مذہبی دھڑوں میں مزید مُنقسم کرنے کے لیے کُچھ اور دینی جماعتوں کو الیکشن ۲۰۱۸ء میں سامنے لایا گیا۔ تحریک لبیک پاکستان، ملی مُسلم لیگ یا تحریک اللہ اکبر یا جماعت الدعوۃ، اھلِ سُنت والجماعت (سابقہ سپاہِ صحابہ یا مِلّتِ اسلامیہ) اور مُتحدہ مجلسِ عمل خم ٹھونک کر میدان میں اُتریں اور اپنے ترکش کے سبھی تِیر چلا کر جو سمیٹ پائیں وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اس ساری ایکسر سائز کے نتیجے میں سٹیٹ آرکیٹیکٹس نے نہ صرف ن۔ لیگ کو پچھاڑ دیا بلکہ اپنی نئ کٹھ پُتلی کو بھی کامیاب کروا لیا اور ساتھ ہی دینی جماعتوں کے بیلٹ بکس کے ذریعے کسی بھی ایڈونچر کے خواب کو چکنا چُور بھی کر دیا۔ انتخابی نتائج کے بعد اِتحادی دینی جماعتوں کے کارکنان ایک دوسرے کے خلاف مورچہ زَن ہیں اور لگے ہیں اِک دُوجے پر طعن وطنز کے تیر چلانے؛ یہ سٹیٹ آرکیٹیکٹس کی ایک اور بڑی اچیومَینٹ ہے۔ لیکن میرا یہ کنسرن ہی نہیں! سٹیٹ آرکیٹیکٹس نے جو چاہا وہی کرتے چلے آئے ہیں، وہی کیا ہے اور جو چاہیں گے وہی کرتے رہیں

گے۔اس کو کاؤنٹر کیسے کیا جائے اِس پر بات پھر کسی وقت کریں گے؛فی الحال میرا موضوع دینی قیادت کی سادگی اور اِن کے کارکنان کی خاموش تقلید ہے۔میرا گُمان اب یقین میں بدلتا جا رہا ہے کہ دینی قیادت اپنے شاندار ماضی میں ابھی تک محوِ سَفر ہے، یہ بات درست ہے کہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اسلام پسند ایک بڑی طاقت تھے۔یہ اُس طاقت کو اُس وقت اپنے حق میں استعمال نہ کر سکے اور وہ وقت ہاتھ سے نِکل گیا۔تین دہائیوں میں بہت سا پانی پُلوں کے نیچے سے گُزر چُکا ہے۔اِس دوران ایک ایسی نَسل پروان چڑھ چُکی ہے جو نہ صرف یہ کہ مذہب سے مُتعارف ہی نہیں (میں نے مذہب بیزار نہیں کہا) بلکہ اُس کی نظر میں دینی قیادت اور اِسلام پسندوں کا جو اِمیج ہے وہ کُچھ بہتر نہیں۔اس میں قصُور وار نئی نسل ہے یا دینی قیادت؟ میری دانست میں دینی قیادت! دین کے علمبرداروں کو دو دھڑوں میں تقسیم کرکے میں اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوں۔جمعیت عُلماء اسلام اور جماعتِ اسلامی: میری دانست میں اسلام پسند طبقے کی سیاسی نُمائندگی انہی دو جماعتوں کے پاس ہے۔دیگر جماعتیں صرف فوٹو شُوٹ کے لیے اِن کے ساتھ کبھی کبھی آن کھڑی ہوتی ہیں۔مزید برآں جمعیت عُلماء پاکستان کے اُمیدواران اور ووٹرز دونوں ہی فی الحال تحریک لبیک پاکستان لے اُڑی ہے جس کی جلد واپسی کا اِمکان بہت کم ہے؛اسی لیے میں جمعیت عُلماء پاکستان کا تذکرہ دانستہ نہیں کر رہا۔

مولانا فضل الرحمن

متحدہ مجلسِ عمل کی سب سے بڑی اتحادی جماعت؛ جمعیت عُلماء اسلام مسلکِ دیوبند کی نُمائندہ جماعت ہے اور ۱۹۱۹ء میں قائم ہونے والی جمعیت عُلماء ہند ہی کا تسلسل ہے۔مسلک کے نام پر سیاست جمعیت کی پُرانی روایت ہے۔۱۹۸۵ء میں جب مَیں ہائی سکول کا طالبعلم تھا تَب مُجھے خانیوال میں مُحترم مولانا فضل الرحمٰن کو پہلی بار براہِ راست سُننے کا اِتفاق ہُوا۔اُس وقت وہ جنرل ضیاءالحق کے خلاف اپوزیشن کے ایم آر ڈی نامی گرینڈ الائنس کا حصہ تھے۔

مولانا دلیل کے بادشاہ ہیں اور اُن کی یہ خُوبی ہے کہ وہ اپنے مؤقف کو پُورے اعتماد سے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مولانا فضل الرحمٰن، جمعیت اور ایم ایم اے کے حوالے سے چند پوائنٹس پر بات کرنے کے بعد جماعتِ اسلامی کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کروں گا۔جمعیت علماء اسلام کی سیاست کا تمام تر انحصار مسلکِ دیوبند پر ہے،کبھی مولانا سمیع الحق اور مولانا اجمل قادری بھی اپنے اپنے دھڑے بنا کر فعال رہے ہیں لیکن کامیابی مولانا

فضل الرحمٰن کے ہمرکاب ہُوئی اور یُوں وہ اکیلے ہی اب اس قافلے کے سالار رہیں۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ مولانا اپنے جیتے جی اپنے ہم پلہ کوئی مُتبادل شخصیت پَنپنے نہ دیں گے؛ پنجاب میں مولانا کی جماعت کی پیشقدمی نہ ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ مولانا کے پاس خیبر پی کے اور بلوچستان میں کُچھ مخصوص پاکِٹس ہیں جن کی بُنیاد پر وہ پارلیمنٹ میں ہمیشہ ایک خاص حُجم کے ساتھ پہنچتے چلے آرہے ہیں۔ سِندھ میں اُن کی جماعت نے سومرو صاحب کی قیادت میں کُچھ پیش رفت کی تھی لیکن ابھی سیاسی طور پر کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں سمیٹی جاسکی جبکہ پنجاب مُکمل طور پر نظر انداز ہے یا دیگر مذہبی جماعتوں کی طرح پنجاب میں وہ اپنے لیے کوئی جگہ نہیں بنا پا رہے۔ پنجاب میں دیوبند مَسلک کی بُنیاد پر ۱۹۸۵ء میں مولانا حق نواز جھنگوی نے ایک مؤثر تحریک برپا کی جسے زبردست مقبولیت اور طاقت حاصل ہوئی۔ لیکن جلد ہی یہ تشدد کی راہ پر ڈال دی گئی یا ازخود چل پڑی؛ نتیجتاً ریاست نے اسے بالکل محدود کر کے دم لیا۔ جمعیت علماء اسلام اُن کے شدت پر مبنی بیانیے کی وجہ سے اُن سے گُریزاں ہوئی۔ محدود ہو جانے کے باوجود سابقہ سپاہِ صحابہ بعد ازاں مِلّتِ اسلامیہ اور اب اہل سُنت والجماعت ابھی تک اپنی الگ شناخت قائم کیے ہوئے ہے اور محسوس یہی ہوتا ہے کہ اہل سُنت والجماعت اور جمعیت علماء اسلام ایک دوسرے سے گُریزاں ہی رہیں گی۔

ایک جماعت البتہ پنجاب میں ابھی تک سائیلنٹ موڈ میں موجود ہے جو دیوبند مسلک کی ترجمانی و قیادت کا فریضہ بطریقِ احسن سرانجام دے سکتی ہے اور وہ ہے امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس احرارِ اسلام۔ مجلس احرارِ اسلام نے تحریک آزادئ ہند، تحریک ختمِ نبوت اور تحریک نظامِ مُصطفیٰ میں عوام الناس کی قیادت کا فریضہ سرانجام دیا اور قربانیوں کی ایک لازوال داستاں رقم کی؛ امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے پوتے اور نواسے اب اس تحریک کے سالار رہیں۔

مولانا فضل الرحمٰن بہت زیرک اور منجھے ہوئے سیاستدان ہیں اور ایک خُود مُختار جماعت کے سربراہ ہونے کے ناطے یہ اُن کا حق ہے کہ وہ اپنے لیے جو بھی بہتر سمجھیں وہی فیصلہ کریں یا جس حکومت کا چاہیں حصہ بنیں؛ لیکن اِس بار اُن سے یہ چُوک ہُوئی کہ وہ نواز شریف کے آخری دورِ حکومت میں سٹیٹ آرکیٹیکٹس کے بدلتے تیور نظر انداز کر گئے، دوسرا یہ کہ نواز شریف کے اقتدار کی ڈوبتی کشتی سے بَروَقت چھلانگ لگانے کی بجائے حکومت کے آخری دن تک نواز

شریف کی وکالت کرتے رہے۔ مذہبی قیادت کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے خِلاف پروپیگنڈے یا عوامی پرَسپشن کی پرواہ نہیں کرتی اور مولانا کے مُعاملے میں بھی یہی ہُوا۔ مثلاً عمران خان نے جب پہلی بار مولانا کی جلسۂ عام میں کردارکُشی کی تو مولانا نے اُس کی پرواہ ہی نہ کی، نتیجتاً مولانا کا تذکرہ ہر جَلسے کا لازمی جُزو بن گیا۔ نئی نسل میں مقبول ہوتے لِیڈر نے مولانا کی شخصیت کے بارے میں ایک منفی تأثر کو زبان زدِ عام کر دیا اور یُوں مولانا کی شخصیت داغدار ہوگئی جس کا خمیازہ مُتحدہ مجلس عمل کو بُھگتنا پڑا۔ مَسلک کے پیشوا ہونے کے ناطے مولانا کی شخصیت، حیثیت اور مقام ومرتبہ عقیدت کے ایک ایسے بُت کی شکل اختیار کر چُکے ہیں جہاں اُن کے کارکنان یا مُقلدین یہ جسارت کر ہی نہیں سکتے کہ وہ اُنہیں کوئی بھی ایسا مشورہ دے سکیں جس کا تعلق اُن کی اپنی ذات یا اندازِ سیاست کے ساتھ ہو؛ حافظ حُسین احمد والا مُعاملہ سب کے سامنے ہے۔

انتخابی نتائج وہی آئے جو سٹیٹ آرکیٹیکٹس ڈیزائن کر چُکے تھے لیکن انتخابی شکست کے بعد محترم مولانا فضل الرحمٰن کا انتہائی سخت بیان سب کو حیرت زدہ کر گیا اور ضرب کی اُس شِدّت کو بھی افشا کر گیا جو ان انتخابات کے نتیجے میں اُنہیں اور مُتحدہ مجلسِ عمل کو لگائی گئی۔ مولانا فضل الرحمٰن کے ردعمل سے لگا کہ وہ اینٹی اسٹیبلشمنٹ بیانیہ کو لے کر آگے چلیں گے؛ اس پر اِس آرٹیکل کی تکمیل کے بعد الگ سے بات کروں گا۔

جماعت اسلامی

جماعتِ اسلامی مُتحدہ مجلسِ عمل کی دوسری بڑی اتحادی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان احیائے اسلام کی ایک پُرامن تحریک ہے جس کا آغاز بیسویں صدی کے مُفکرِ اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قیامِ پاکستان سے قبل ۲۶ راگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں کیا تھا۔

جماعت اسلامی لوگوں کو اپنی پوری زندگی میں اللہ اور حضرت محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ جماعت سیاست میں خدا کے نافرمان لوگوں کی بجائے زمام کار مومنین وصالحین کو سونپنے کا کہتی ہے تاکہ نظامِ سیاست کے ذریعے خیر پھیلے اور لوگ اسلامی ضابطۂ حیات کی خیر وبَرکت سے مُستفید ہو سکیں۔

جماعتِ اسلامی میں لوگوں کے لیے کشش کی وجہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فِکر ہے۔ سید مودودیؒ نے اپنے لٹریچر میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذِھن میں اسلام کے حوالے سے اُٹھنے

والے سوالات اور شُبہات کا مُدلل جواب دیا ہے۔ سید مودودی کے پولیٹیکل اسلام اور اسلامی ریاست کے تصور کو نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ عالمِ عرب میں بہت زیادہ پذیرائی مِلی۔ مصر کی اخوان المسلمون بھی اسی فکر کی علمبردار ہے۔

پاکستان میں اسلامی جمعیت طلبہ کی صُورت میں نوجوان طلبہ اس تحریک کا ہراول دستہ بنے جنھوں نے اپنی انتھک محنت اور قربانیوں سے پاکستان کے تعلیمی اداروں کو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں کمیونزم، لادینیت اور بدتہذیبی کے عفریت سے نجات دلائی۔ جماعتِ اسلامی نے تحریک ختمِ نبوت اور تحریک نظامِ مصطفٰے میں ایک فعال کردار ادا کیا جبکہ مُلک سے آمریت اور کرپشن کے خاتمے کی تحریکوں کی روحِ رواں بھی رہی۔

انتخابات میں مُسلسل ناکامیوں اور نوجوانوں میں پائے جانے والے اضطراب اور غم وغُصے کے باوجود جماعت کی قیادت اور ارکان کا اپنی دعوت اور پُرامن جدوجُہد سے جُڑے رہنا اور انتخابی عمل (بیلٹ باکس) ہی کو ایک صاف سُتھری اور صالح قیادت کی کامیابی کی اُمید قرار دینا ہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔ مُلکی سیاست میں اس قدر فعال رہنے کے باوجود جماعت آج تک معاشرے کی ایک بڑی تعداد کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب کیوں نہ ہوئی اور کوئی بڑی انتخابی کامیابی کیوں نہ حاصل کر سکی؟ اسی پر بات کرتے ہیں:

جماعت کا دعوتی لٹریچر اور تنظیمی ڈھانچہ جس طرح کے افرادِ کار کا مُتقاضی ہے اُس پر عام فرد کا پُورا اُترنا بہت مُشکل ہے، کوئی بھی عام فرد جماعت کی دعوت سے مُتفق ہوتے ہی فوراً جماعت کا رُکن نہیں بن سکتا۔ جماعت میں باقاعدہ شمولیت کافی لمبا پروسیس ہے۔

جماعت جو نہیں کر سکی وہ یہ ہے کہ ایک عام پاکستانی کے لیے کوئی ایسا عام فہم پروگرام یا سادہ سا نعرہ نہیں دے سکی جو زبان زدِ عام ہو جائے اور وہی اس مُلک کے عوام کے دِل کی آواز بن جائے۔ جب آپ ایک سیاسی جماعت ہیں تو ووٹر کی زباں بولیں گے یا اُس کے مُنہ میں اپنی زباں رکھ پائیں گے تب ہی بات بنے گی۔ جماعت کا اصرار ہے کہ وہ اسلامی نظامِ حکومت ہی کے نام پر ووٹ لے گی جبکہ قوم بھی مُصر ہے کہ وہ اسلام کے نام پر ووٹ نہیں دے گی۔

مذہب کی بُنیاد پر مسلکی جماعتوں کا اپنا ایک ووٹ بنک ہے جو صرف اُنھی کو مِلتا ہے جبکہ

جماعت اسلامی کسی الگ مسلک کا پرچم اُٹھائے ہوئے بھی نہیں ہے۔ عوامی جماعت نہ بن پانا ہی جماعت کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے اور اس چیلنج سے جماعت کی قیادت نبرد آزما نہیں ہو پا رہی۔ جماعت میں عوامی نمائندگی کی خواہش تو موجود ہے لیکن انتخابی کامیابی کا چیلنج اس کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت پانچ سال مُختلف سرگرمیوں میں مصروف رہتی ہے اور جب الیکشن کا وقت آتا ہے تو ووٹ مانگنا شروع کر دیتی ہے جو نہیں ملتے۔

جماعت کا اصرار ہے کہ وہ اسلامی نظام حکومت ہی کے نام پر ووٹ لے گی جبکہ قوم بھی مُصر ہے کہ وہ اسلام کے نام پر ووٹ نہیں دے گی۔

۱۹۸۸ء میں اسلامی جمہوری اتحاد میں شمولیت اور حکومت میں بغیر کوئی کردار ادا کیے اسلامی جمہوری اتحاد سے علیحدگی جماعت کا وہ فیصلہ تھا جس نے جماعت کی سیاسی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچایا۔ تبھی جماعت کا ووٹر ذہنی انتشار کا شکار ہوکر اِدھر اُدھر بکھر گیا۔ جبکہ ۱۹۹۳ء سے ۲۰۱۸ء تک کسی ایک پالیسی پر یکسُوئی سے کھڑے نہ ہونا بھی ناکامی کی ایک بڑی وجہ ہے۔

مثلاً ۱۹۹۶ء میں کرپشن کے خلاف تحریک سابق امیرِ جماعتِ اسلامی قاضی حُسین احمد کی ایک زبردست کاوش تھی، سب سے پہلے اِس مُلک میں قاضی صاحب ہی نے کہا کہ پیپلز پارٹی اور ن۔ لیگ دونوں کرپشن کی علامت ہیں۔ دونوں ایک ہی تھالی کے چَٹّے بَٹّے ہیں، ایک ہی کھوٹے سکے کے دو رُخ ہیں اور یہ کہ ان دونوں پارٹیوں نے باریاں لگائی ہوئی ہیں۔

ان کی اس تحریک میں جماعت کے کارکنان نے انتھک جدوجہد کی اور پیپلز پارٹی اور ن۔ لیگ کے خلاف تاریخی دھرنوں میں حکومتی ظُلم و جبر کا سامنا کیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ نتیجتاً دو حکومتوں کو اسی تحریک کی وجہ سے کرپشن چارجز پر گھر جانا پڑا لیکن جماعت نے اپنی ہی کامیاب تحریک کے بعد ہونے والے قومی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ جماعت پانچ سال مُختلف سرگرمیوں میں مصروف رہتی ہے اور جب الیکشن کا وقت آتا ہے تو ووٹ مانگنا شروع کر دیتی ہے جو نہیں ملتے۔

اگلے انتخابات میں جماعت نئے پروگرام اور نئے نعروں کی طرف مُتوجہ ہوئی جبکہ کرپشن کے خلاف قاضی حُسین احمد کے اُسی نعرے کو عمران خان نے اپنا لیا اور یہ نعرہ مقبولِ عام ہوگیا۔ اِدھر ۲۰۱۳ء کے بعد جماعت نے گزشتہ پانچ سال اپنے جھنڈے اور اپنے نشان

پر الیکشن لڑنے کے لیے اپنے کارکنان کو چارج کیا اور جب وہ پُوری طرح مُتحرک ہو چکے تو مُتحدہ مجلسِ عمل کو دوبارہ زندہ کر دیا گیا۔ کارکنان نے جماعت کے اس فیصلے کو بے دِلی سے قبول کیا۔ اس کی وجہ تھی مولانا فضل الرحمٰن کی نواز شریف حکومت کی وکالت کا مُمکنہ نقصان؛ کیونکہ جُونہی مُتحدہ مجلسِ عمل کے پہلے مُشاورتی اجلاس کے حوالے سے خبریں میڈیا کی زینت بنیں تو عوام نے ہمیں سینگوں پر اُٹھا لیا مساجد اور مارکیٹوں میں جو لوگ ہم سے مُتعارف تھے اُنہوں نے یہ کہنا شُروع کر دیا کہ یہ اتحاد جماعت کی بہت بڑی غلطی ہوگی؛ آپ نے ووٹ کِن سے لینے ہیں؟ عوام سے! جبکہ عوام کا مُوڈ مُتحدہ مجلسِ عمل کے دوبارہ فعال کئے جانے سے بہت پہلے کارکنان کے سامنے آ چُکا تھا۔ کارکنانِ جماعت اس فیصلے پر بہت سٹپٹائے، شور بھی خُوب مچا لیکن ان کی بات کو کوئی خاطر میں نہ لایا نتیجتاً عوام جماعت کو خاطر میں نہیں لائی۔

مُتحدہ مجلسِ عمل کی بحالی کے لیے ۲۰۱۳ء میں خیبر پی کے میں ہونے والے انتخابی نتائج پر کیلکولیشن کی گئی اور یہ دلیل دی گئی کہ جماعتِ اسلامی اور جمعیت علماءِ اسلام مِل کر اتنی اضافی سیٹیں نکال سکتے ہیں؛ پنجاب اور سندھ کے کارکنان کے جذبات کا اِس جمع تفریق میں کہیں ذکر نہ تھا۔ ویسے بھی یہ کیلکولیشن پانچ سال پُرانی تھی۔ سٹلائیٹ اور سوشل میڈیا کے اِس دور میں جہاں پروپیگنڈے اور اطلاعات کے طوفان رائے عامہ کو ہر روز اِک نیا رُخ دیتے ہیں وہاں پانچ سال پُرانی جمع تفریق پر سیاسی فیصلے حکمت سے بالاتر ہیں۔

ارکان کا کردار

جماعت کی ہزیمت کی اصل ذمہ داری جماعت کے ارکان پر عاید ہوتی ہے وہ ایسے کہ اگر امیرِ جماعتِ اسلامی یا مرکزی شُوریٰ کوئی بھی ایسا فیصلہ کریں جو ارکانِ جماعت کی دانست میں جماعت کو کسی گہری کھائی میں دھکیل سکتا ہو یا جماعت کے مُستقبل پر منفی اثرات مُرتب کر سکتا ہو تو ایسے کسی بھی فیصلے کے خلاف جماعت کا دستور اپنے ارکان کو یہ رہنمائی اور اختیار دیتا ہے کہ وہ اس فیصلے پر اپنے فورم پر کُھل کر اظہارِ خیال کریں اور اگر اُن کی بات نہ مانی جائے یا وہ اپنے فورم کی وضاحت سے مطمئن نہ ہوں تو ایسی صورت میں جماعت کے فیصلے کے خلاف پاکستان بھر کے ارکان سے اس مُعاملے پر رائے لی جا سکتی ہے۔ لیکن ۱۹۹۳ء میں پاکستان اسلامک فرنٹ کی انتخابی شکست کے بعد مُحترم قاضی حُسین احمد کے استعفیٰ کے علاوہ گزشتہ ۲۵

سالوں میں ارکان سے رائے لینے والی ایسی کوئی ایکسر سائز نہیں ہوئی۔

جب ارکان کسی بھی حکمتِ عملی کو خاموشی سے قبول کرلیں اور بعدازاں اُس پر عمل کرنے کے نتیجے میں کوئی خفت اُٹھانی پڑے تو پھر ارکان کا ایسے فیصلوں پر تحفظ جماعت کی روایت کے خلاف ہے۔ اگر ارکانِ جماعت کی بھی یہی منشاء ہے کہ جماعت دائروں میں ہی سفر کرتی رہے تو پھر خاموشی سے یہ سب دیکھتے رہیں اور جواباً جو آپ کے ساتھ ہورہا ہے اس کو تحمل سے برداشت کریں کیونکہ یہ آپ کا خود اختیار کردہ راستہ ہے۔

جماعت اگر اپنے ایک نئے جنم پہ راضی ہوجائے یعنی ایک نئی پَنیری کی کاشت کی طرح؛ تیرہ سے چالیس سال تک کی نوجوان نسل پر کام کرے، جلد بازی کا مُظاہرہ نہ کرے اور دس سے پندرہ سال اَنتھک جدوجہد کرے جو ایک ہی خاص ڈائریکشن میں ہو، ہمہ جہت بھی ہو اور مربُوط بھی ہو تو اپنی مرضی کے نتائج حاصل ہوسکتے ہیں۔

لیکن تجاویز سے پہلے بحیثیت ایک عام پاکستانی اور ووٹر کے جماعتِ اسلامی کے دوستوں کے لیے غور وفکر کے کُچھ پہلو ہیں: آپ کے تقویٰ کی بُنیاد پر میں آپ کو ووٹ کیوں دوں؟ تقویٰ اللہ اور آپ کا مُعاملہ ہے مجھے اِس سے کیا لینا دینا؟ مُجھ سے تو آپ میرے صُبح و شام کی بات کریں؛ پینے کو صاف پانی نہیں، دو وقت کی روٹی مُیسر نہیں، بجلی کے بِل ادا ہو نہیں پاتے، تعلیم مہنگی بہت، ڈگری ہے تو نوکری نہیں، سیٹھ کی نوکری میں تحفظ نہیں، میری دستار و رِدا شریفوں، زرداریوں اور عمرانیوں کی دسترس میں ہے، جبکہ تُم ہو کہ دُور کہیں دُور تلک میدان میں نظر بھی نہیں آتے! پھر مَیں اپنا ووٹ تُمہیں ہی کیوں دُوں؟ بحیثیت ایک عام پاکستانی کے اسلامی نظامِ حکومت آپ کا مسئلہ ہوسکتا ہے میرا نہیں! فَقر انسان کو کُفر تک لے جاتا ہے؛ جب میرا دین مجھے فاقہ کشی سے مرنے کی بجائے جینے کے لیے حرام کھانے کی بھی اجازت دیتا ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ بُھوک، غُربت اور اَفلاس کا خاتمہ کسی بھی فرد کی پہلی ترجیح ہے؛

اِکنامِک ڈویلپمنٹ.... سمجھے کُچھ! ویسے بھی ۱۹۷۳ء کا آئین بنوانے میں سب دینی جماعتیں شامِل تھیں تو پھر اِس کے بعد کون سا اسلامی نظامِ حکومت ہے جو تُم لانا چاہتے ہو؟ سوچ سکتے ہو کبھی اِس زاویے سے؟

ہمارے دوست کبھی کبھی اس پہلو پر بھی سوچنا شُروع کردیتے ہیں کہ جماعت اپنا ایک

پولیٹیکل ونگ بنائے اور سیاست اُس پلیٹ فارم سے کرے جبکہ دعوت وتربیت کا کام جماعتِ اسلامی کے پلیٹ فارم سے۔یعنی سیاست اور دین کوالگ الگ کردیا جائے۔سوچ کا یہ زاویہ فکری افلاس کا عکاس ہے۔فرض کریں ایسا کربھی دیا جائے تو کُچھ عرصہ بعد یہی دوست تجویز کرسکتے ہیں کہ چُونکہ پولیٹیکل ونگ تو خالص جماعت نہیں ہے اس لیے اس کو تھوڑا سا اوپن کریں۔

احباب جانتے ہیں کہ اوپن ہونے کے سبھی تقاضے پُورے کرتے کرتے آپ بے راہروی کی ایسی اتھاہ گہرائیوں میں غرقاب ہوسکتے ہیں جہاں سے واپسی مُمکن ہی نہ ہو؛ آپ دس سال بعد شور مچاتے نظر آئیں گے کہ ہمارے ساتھ ایک بار پھر ہاتھ ہوگیا۔پاکستان اسلامک فرنٹ اور پاسبان کے تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ احیائے اِسلام کی کوئی تحریک اوپن ہونا ایفورڈ نہیں کرسکتی۔

شوریٰ کا کردار

جماعت کی پالیسی اور حکمتِ عملی کی تشکیل میں بُنیادی کردار فیصلہ سازی کے فورم کا ہے، مرکزی، صُوبائی، ضلعی یا مقامی شُوریٰ ہی جماعت میں فیصلہ سازی کا مرکز ہیں اور یہ فورم اتنا مضبوط، طاقتور اور مؤثر ہے کہ امیرِ جماعت بھی اسکی مشاورت اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ مُسلط نہیں کرسکتا۔لیکن معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ اراکینِ شُوریٰ کے انتخاب کے وقت ارکان اپنی بُنیادی ذمہ داری سے چشم پوشی اختیار کرتے ہیں۔شُوریٰ ایک ایسا فورم ہے جس نے نہ صرف آنے والے حالات میں درپیش چیلنجز کا جائزہ لینا ہے بلکہ وہ حکمتِ عملی بھی تشکیل دینی ہے جو اِن چیلنجز سے نبُردآزما ہونے کے لیے ارکانِ جماعت کو بالخصُوص اور عوام کو بالعموم رہنُمائی دے سکے۔یعنی جماعت میں شُوریٰ کی حیثیت ایک لائٹ ہاؤس کی سی ہے۔جب آپ لائٹ ہاؤس میں ایک ایسے ٹمٹماتے چراغ کو رکھ دیں جس کی اپنی لَو تیز ہوا کے تھپیڑوں کے سامنے پھڑ پھڑانے لگے اور ایسے کئی ٹمٹماتے چراغ آپ ایک ساتھ جمع کردیں تو وہ مِل کر پُورے لائیٹ ہاؤس کی روشنی کو مدھم کردیں گے۔شوریٰ کی رُکنیت کے لیے ووٹ ڈالتے وقت عموماً یہی دیکھا جاتا ہے کہ پچھلی شُوریٰ میں میرے زون، مقام یا ضلع سے کون سے افراد رُکنِ شُوریٰ تھے، اُنہی کو پھر سے ووٹ دے دیا جاتا ہے۔حالانکہ فیصلہ سازی کے فورم کے

لیے تقویٰ اور پرہیزگاری کے علاوہ ذی شعور، زِیرک اور مُعاملہ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ پر گرفت رکھنے والے اور بغیر کسی لگی لپٹی کے ڈنکے کی چوٹ پر اپنا مافی الضمیر بیان کرنے والے افراد کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ امیر کی ہاں میں ہاں مِلانے والے یا شُوریٰ کے اجلاس میں محض حاضری لگوا کر خاموش تماشائی کی حیثیت سے شرکت کرنے والے اراکینِ شُوریٰ کی۔ تعجب کا مقام ہے کہ ہر حادثے کے بعد ارکانِ جماعت بھی یہ کہتے پائے جائیں کہ پتہ نہیں ایسے فیصلے کہاں سے آتے ہیں؟ فیصلے تو وہیں سے آتے ہیں جہاں کے لیے آپ انتہائی بے توجہی سے افراد کو مُنتخب کرتے ہیں۔ اگر ارکانِ جماعت بیدار مَغزی سے کام لیں اور بے توجہی تَرک کر دیں تو نہ صرف خرابیوں اور خِفت سے بچا جا سکتا ہے بلکہ بہتر سمت میں پیشقدمی کی جا سکتی ہے۔ ارکانِ جماعت جب تک اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہیں گے خیر کی اُمید باقی رہے گی۔ ابھی بھی وقت ہے کہ اپنی بُنیاد کی طرف واپس لوٹ جائیں کہ فلاح کا راستہ وہیں سے نِکلے گا۔ قُرآن وسُنت اور دِل کی دُنیا بدل دینے والا لٹریچر جس نے برسوں تک اِس کھیتی کی آبیاری کی اُسی سے ایک بار پھر اِستفادہ کیا جائے تو بہترین ثمرات سمیٹے جا سکتے ہیں۔

اسلامی انقلاب کا غلط تصور

۷۷ سال گُزرنے کے باوجود ہم انقلاب کیوں نہیں لا سکے؟ انقلاب نہ لا سکنے کے بارے میں اگر آپ کا تصور یہ کہ ہم نظام پر قبضہ کیوں نہیں کر سکے تو آپ اسلام کے بُنیادی تصورِ انقلاب کی رُوح کو ہی سمجھ نہیں پائے۔ آپ کو نہ صرف اسلامی نظریہ کے مُطالعہ کی از سرِ نَو ضرورت ہے بلکہ ایک ایسے صاحبِ بصیرت مُربی کی بھی جو آپ کی سوچ کے زاویے کو درست سِمت دے سکے۔ کیونکہ اگر آپ انقلاب کے کسی خُود ساختہ تصور کو اپنے دل میں لے کر چل رہے ہیں تو آپ کا وجود اپنی ہی تحریک کے لیے کسی فدائی حملہ آور کا ہے۔ انقلاب دل کی دُنیا بدلنے کا نام ہے۔ عقائد کی درستگی، کردار سازی، اجتماعیت کی تشکیل، صلاحیت وصالحیت کا اِمتزاج، نوجوانوں کی صف بندی، امامت وقیادت کی تیاری، گردوپیش سے واقفیت، عالی منظر نامہ سے آگہی، وقت کی رفتار پر گرفت، وسائل کی دستیابی، بصیرت پر مبنی فیصلے اور مُسلسل پیشقدمی انقلاب کے ایسے مدارج ہیں جن کو طے کیے بغیر اسلامی انقلاب برپا کرنا محض دیوانے کا اِک خواب ہے۔ (دانش ڈاٹ کام)

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

مجاہد حسین

فکرِ مودودی اور جماعتِ اسلامی

جمعیت طلبہ کے ٹیلنٹ کا ضیاع

اسلامی انقلاب کے لیے نوجوان نسل کی فکری آبیاری، تعلیم وتربیت اور صف بندی میں اسلامی جمعیت طلبہ کا ہمیشہ سے ہی ایک مثالی کردار رہا ہے لیکن ان کے مُعاملے میں ہم سے کُچھ ایسے بَلنڈرز سرزد ہوئے ہیں جو فیصلہ سازوں کی فہم وفراست پر سوالیہ نشان ہیں۔ یہ سب نوجوان ایک شاندار اسلامی انقلاب کے خوابوں کو دِل میں بسائے اپنی زندگی کا قیمتی ترین دَور جمعیت کی نذر کرتے ہیں اور اس کے لیے اپنی جان، مال، وقت اور کیریئر کی قُربانی دیتے دیتے ایک روز ایسے مقام پر آن کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے اِن کا تعلیمی زندگی سے تعلق ختم اور عملی زندگی سے جُڑتا ہے؛ بس اِسی مقام پر ''لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی'' والا مُعاملہ ہُوا جس نے اسلامی انقلاب کے خواب کو زمیں بوس کردیا۔ اپنے ہیومن ریسورس کی تعلیم اور صلاحیت کے مُطابق عملی زندگی میں اُن نوجوانوں کی ایڈجسٹمنٹ کا کوئی جامع منصوبہ نہ ہونا ہی ہماری حکمتِ عملی کا وہ سُقم ہے جس کے سبب فکری بالیدگی کے حامِل نظریاتی طور پر تربیت یافتہ لاکھوں نوجوان معاشرے میں جا کر گُم ہو گئے اور انقلاب کی جانب پیشقدمی کی تحریک تہی داماں وتہی دَست پیچ چورا ہے اِن جوانوں کی منتظر کھڑی ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

مثلاً جمعیت کے رُفقاء سے ارکان تک جتنے طلبہ تھے اُن کی کیریئر پلاننگ جمعیت سے ان کی فراغت سے ایک سال پہلے کرلی جاتی اور جُونہی کوئی فرد جمعیت سے فارغ ہونے لگتا وہ اپنے لیے پہلے سے طے شُدہ فیلڈ جوائن کرلیتا اور زندگی آپ کے نام کردیتا۔ فرض کریں اگر جماعت سب کے لیے یہ لازم کردیتی کی ہمارا ہر نظریاتی طالبعلم اپنی تعلیم اور قابلیت کے مُطابق سرکاری جاب ہی کرے گا چاہے وہ کلرکی ہو، سکول ٹیچنگ، فوج، پولیس، یا سِول سروس

کی افسری ہو، تو آج ریاستی اداروں کی ہیئت کُچھ اور طرح کی ہوتی۔ مُناسب رہنمائی نہ ہونے کے سبب یہ نوجوان ازخود فیلڈ میں نکلے، جو سروائیو نہ کر سکے وہ شرمندگی کے مارے نہ لوٹے اور جو ازخود سروائیو کر گئے وہ ویسے ہی فنافی الدُنیا ہو گئے۔ جماعتِ اسلامی کے ہاتھ کیا لگا؟ ۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تیری دے کے تجھے فکرِ معاش

ہم نے ۱۹۹۰ء کی دہائی میں اپنے کانوں سے سُنا اور اپنی آنکھوں سے اُن لیڈران کو دیکھ بھی لیا جو یہ پرچار کرتے نظر آئے کہ سرکاری نوکری اس لیے نہیں کرنی کہ آپ اکیلے کارِسرکار میں جا کر کِیا تیر مار لیں گے؟ عرض کیا گیا: سرکار! اگر سب مِل کر جائیں اور ہر سال جاتے رہیں تو کارِسرکار کا ماحول رفتہ رفتہ بدل بھی سکتا ہے؛ نقّار خانے میں طُوطی کی بھلا پہلے کب سُنی گئی تھی جو تب سُنی جاتی۔

یُوں لاکھوں نظریاتی نوجوان جن سے اِس ریاست کی خِدمت کا کام لیا جا سکتا تھا اُنہیں پلاننگ کے اِس سُقم نے سمندر بُرد کر دیا، رزقِ خاک بنا دیا اور فکرِ معاش اِس قیمتی اثاثے کو ہڑپ کر گیا۔ پُراَمن اسلامی انقلاب کی قیادت کے لیے بانیٔ جماعتِ اسلامی سید مودودی نے جس ہیومن ریسورس کی ضرورت پر فوکس کیا وہ ایسی افراد سازی کی مُتقاضی ہے جو نہ صرف صلاحیت کے اعتبار سے بہترین افراد ہوں بلکہ صالحیت کا بھی قابلِ رشک نمُونہ ہوں انقلاب کے لیے معاشرے کی قیادت اور اِمامت کے منصب پر جب ایسے بہترین لوگ فائز ہوں گے تو وہ ایک پُراَمن انقلاب کے خواب کو کامیابی سے ہمکنار کر پائیں گے اور مُعاشرہ ایسے لوگوں کی قیادت میں برپا ہونے والے انقلاب میں خُود کو محفوظ تصور کرے گا ۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

معاشرے میں تعلیم یافتہ طبقے کی ایک قابلِ ذکر تعداد نے سید مودودیؒ کی تحریروں سے استفادہ کیا اور جماعتِ اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کا حصہ بنے۔ ہم صرف اسلامی جمعیت طلبہ پر بات کریں گے کیونکہ اس وقت جماعت میں جو لوگ مُتحرک ہیں ان کی اکثریت جمعیت ہی کے توسط سے جماعت میں آئی ہے۔ عمُومی درجہ بندی کے اعتبار سے تین طرح کے نوجوان اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہوئے۔ بہت ذہین وفطین [میڈیکل کالجز اور انجینئرنگ یُونیورسٹیوں کے طلبہ]، اوسط درجے کی ذہنی سطح والے لیکن بہت مُتحرک نوجوان، اور عام طلبہ جو بطور حامی کے ساتھ ہو چلے۔ دُوسری طرح کی درجہ بندی میں پہلے نظریاتی اعتبار سے مضبوط افراد [مُطالعہ لٹریچر، عبادات اور مُعاملات میں بہترین لوگ]، دوسرے بہت مُتحرک لیکن فکری اعتبار سے مُناسب درجہ میں، تیسرے حامی یا کارکن، اور چوتھے تعلیمی اداروں میں اسلامی جمعیت طلبہ کے عروج اور عزت وتکریم کو دیکھ کر کسی خاص ایجنڈا کے تحت جمعیت کے ساتھ چلنے والے جوان سمجھنے کے لیے مزید آسان کردوں کہ ایسے طلبہ بھی جمعیت میں شامل ہوئے جو یہ دیکھتے تھے کہ جمعیت کے کارکنوں کو کالج یا یُونیورسٹی میں ہر طالبعلم سلام کرتا ہے تو ہم بھی جمعیت کا بیج لگا لیں۔ اتنی ننھی مُنھی خواہشات بھی ہوتی ہیں نَوعُمری کے اُس پہر: یہ آخری درجے کے لوگ کبھی جمعیت کے نظم پر حاوی نہیں ہو سکے البتہ انہی موقع پرستوں کی بعض منفی حرکات اسلامی جمعیت طلبہ سے منسُوب رہی ہیں۔ ایسے جوان زمانۂ طالبعلمی کے بعد عملی زندگی میں جماعتِ اسلامی کو دستیاب بھی نہیں ہوئے کیونکہ اِن کی نظریاتی تربیت ہو ہی نہیں پائی۔

ذہینفطین لوگ اسلامی جمعیت طلبہ سے ہوتے ہُوئے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں مصروف ہو گئے۔ اسلام پسند جذبے کے تحت ڈاکٹرز اور انجینئرز نے نظریاتی فورمز بنائے اور اپنے تئیں کشمکشِ انقلاب کو جاری رکھنے کی کوشش کی: ان افراد نے اپنی پیشہ وارانہ صلاحیت میں اور معاشی طور پر بہت ترقی کی اور اپنے پراجیکٹس کے ذریعے خدمت خلق بھی: حتٰی کہ بعض

لوگوں نے انفرادی طور پر اپنے شعبے میں بہت بڑے بڑے پراجیکٹس بھی کیے۔لیکن جماعتِ اسلامی کی مین سٹریم لِیڈرشپ کے لیے یہ لوگ دستیاب نہیں ہوئے اور ان کے بارے میں یہ گُمان بھی کرلیا گیا کی یہ پیما [پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن] اورانجینئرز فورم کے لوگ ہیں۔ پیما تو میڈیکل اور خِدمات کے شُعبے میں کافی کُچھ ڈیلیور کرپائی لیکن انجینئرز فورم کی تحریکِ اسلامی کے لیے خِدمات نشستن، گُفتن و برخاستن سے زیادہ کُچھ نہیں؛ روٹری کلب بھی اِن سے زیادہ مُتحرک ہے۔اسی طرح تنظیمِ اساتذہ پاکستان بھی بہت ہی قیمتی افراد نِگل گئی۔ہم نے کُچھ نظریاتی دھڑے کسی وقتی ضرورت کے تحت مثلاً مارشل لاء دور میں مُختلف محکموں میں اپنی بقا کے لیے یا نظریاتی کشمکش [اسلام بمُقابلہ کمیونزم، سوشلزم] کے دور میں بنائے اور پھر کبھی اِن فیصلوں پر بدلتے حالات میں نظرِ ثانی کرنے یا رجُوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ یہ قابل ترین نظریاتی اثاثہ چُونکہ الگ الگ کیمپوں میں چلا گیا اسی لیے یہ افراد جماعت اسلامی کی مین سٹریم لیڈر شِپ اور فیصلہ سازی کے فورم یعنی کہ مجالِسِ شُوریٰ کی رُکنیت کے لیے کبھی مُنتخب ہی نہیں ہو پائے۔

اب بچ گئے اوسط درجے کی ذہنی صلاحیت رکھنے والے مُتحرک نوجوان؛ اِن میں سے جو بہت تیز طرار اور تیکھے تھے وہ تو جماعت کے ہاتھ ہی نہیں آئے۔البتہ کُچھ ایسے مہربان تھے کہ جنھوں نے اپنی اُفتادِطبع کے پیشِ نظر جماعتِ اسلامی جوائن تو کرلی لیکن جماعت کے مناصب، وسائل، اور روابط کا ناجائز استعمال کرکے اپنے ذاتی کاروباری منصوبوں کی ریت ڈالی اور کامیاب ہونے کے ساتھ ساتھ جماعت میں ایک کاروباری طبقۂ اشرافیہ کی بُنیاد رکھی۔

جماعت میں ذہین اور مُخلص لوگوں کے آگے بڑھنے کا راستہ بھی اِنہی لوگوں نے روکا ہے؛ یہ لوگ چند ہیں لیکن اپنی مضبوط لابنگ اور سرمائے کی بدولت سِسٹم پر اثر انداز ہیں۔اِن حضرات کے علاوہ باقی ماندہ اوسط درجے کی ذہنی صلاحیت رکھنے والے سادہ لوح لوگ ہی جماعتِ اسلامی کے ۳۵ سال پر مُشتمل قریب کے زمانہ کا ماضی و حال ہیں اور شاید مُستقبل بھی یہی ہیں۔آنے والے سالوں میں تازہ دَم خُون جو جماعت میں شامل ہوگا تو وہ بھی اِنہی جیسے ہوں گے۔

سمجھ لینا چاہیے کہ یہی ہمارا نصیب ہے۔ یہ لوگ نظریاتی ہیں، پُرعزم ہیں، محنت کش ہیں لیکن کسی بھی انقلاب یا عوامی مقبولیت پر مبنی سیاست کے لیے جس درجہ کے باشعور، فعال، تیز طرار اور بدلتے حالات کی نبض پر دسترس رکھنے والے صاحبانِ فہم وفراست اور حکمت و بصیرت کی ضرورت ہے جماعت کی یہ موجودہ قیادت اُس معیارِ مطلوب سے کوسوں دُور ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض فزیکل لیبر کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ حکمت وبصیرت کے نہ تو مارکیٹ میں انجیکشنز ملتے ہیں اور نہ ہی کیپسولز۔ مطلب یہ کہ ایسی کسی فکری ورُوحانی بیماری یا کمزوری کا ازالہ کسی بیرونی علاج سے مُمکن ہی نہیں۔

اسمٰعیل ہانیہ و خالد مشعل [فلسطین]، راشد الغنوشی [تیونس]، مُحمد مُرسی [مصر] اور طیب اردگان [تُرکی] آسمان سے نہیں اُترے بلکہ یہ اسی دھرتی کی مخلوق ہیں اور اہلِ بصیرت ہیں۔ ہم اہلِ وطن میں کیا ایسا کوئی لیڈر دُور دُور تک اپنے ہاں دیکھتے ہیں؟

کراچی جماعت نے حافظ نعیم الرحمٰن کی قیادت میں کُچھ انگڑائی لی ہے، اُنہوں نے لوکل ایشوز پر فوکس کیا ہے اور عوام میں اپنے لیے اعتماد کو بحال کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھے ہیں۔ حافظ نعیم الرحمٰن جیسے کُچھ دیوانے آپ کو ہر بڑے شہر میں درکار ہیں۔

جماعتِ اسلامی کو ایک نئے جنم کی ضرورت ہے جو ارکانِ جماعت کی دلچسپی، بیدار مغزی ومُداخلت، جماعت کے اندر بڑے پیمانے پر احتساب اور اصلاحات، غیر مُبہم اور واضح پالیسی اور موٴثر حکمت عملی کے زریعے ہی مُمکن ہے۔ یہاں میرے مُخاطب اِسلام پسند عوام، دینی جماعتیں اور مذہبی گروہ بھی ہیں۔ ہم نے اپنے ماضی میں دینی مُعاملات اور سیاسی حماقتوں کی ایسی تاریخ رقم کی ہے کہ مزید تجربات کے لیے عالمی منظر نامہ ہمیں شاید دس پندرہ سال سے زیادہ کی مُہلت ہی نہ دے۔ ۲۰ مارچ ۲۰۰۳ء کو عراق پر امریکی حملے سے شُروع ہونے والی لڑائی عراق، لیبیا، یمن وشام کو اپنی لپیٹ میں لے چُکی ہے۔ چھینٹے لگنے کا یہ سلسلہ اِک نہ اِک روز ہمارے گھروں تک پہنچ کر ہی رہے گا۔ جس روز سعودی عرب یا ایران میں سے کوئی ایک بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا اُس کے بعد ہمارے لیے مُہلتِ عمل شاید ختم ہو جائے۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے خطرات کبھی ٹلتے نہیں۔

جماعت کے نئے جنم میں نئے دَور کے تقاضوں کے مُطابق پیشقدمی کی نئی جہتیں کیا ہونی چاہئیں؟ اسی ضمن میں کُچھ تجاویز حاضر ہیں: جماعت اگر اپنے ایک نئے جنم پر راضی ہو جائے یعنی ایک نئی پَنیری کی کاشت کی طرح؛ تیرہ سے چالیس سال تک کی نوجوان نسل پر کام کرے، جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے اور دس سے پندرہ سال اَنتھک جدوجہد کرے جو ایک ہی خاص ڈائریکشن میں ہو، ہمہ جہت بھی ہو اور مربُوط بھی؛ تو اپنی مرضی کے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ بزمِ پیغام، اسلامی جمعیت طلبہ، جے آئی یُوتھ، لیبر ونگز، طالبات، خواتین اور جماعتِ اسلامی سب ہی اپنے اپنے مُعاملات، لیڈرشپ، فیصلہ سازی کے فورمز، پالیسیز اور حکمتِ عملی کو از سرِ نَو ترتیب دیں۔ مزاحمت کی بجائے دلیل کو اپنا مطمع نظر بنائیں تا کہ فکری طور پر ایک مضبوط معاشرہ ترتیب دیا جا سکے۔

اندرونی اصلاحات کی ضرورت

جماعت اپنی بقا اور نشو نُما چاہتی ہے تو بہت تفصیل سے اندرونی اصلاحات کرے۔ فرد، معاشرہ، دعوت، تنظیم، تحریک، سیاست، دستور، مناصب، ذمہ داران، ارکان، شوریٰ اور مجلسِ عاملہ؛ اِن سب معاملات پر اپنی روایات اور طرزِ عمل کا دیانتدارانہ تجزیہ کرے اور بدلتے دور کے مُطابق ضروری فیصلے کرے۔ تھرڈ پارٹی آڈٹ مثلاً عوام اور معاشرے کے مختلف طبقات سے اپنے بارے میں مجموعی تأثر، عدمِ قبولیت کی وجوہات اور ناکامیوں کا تفصیلی سروے کروائے۔ پلاننگ اور مؤثر حکمتِ عملی کے لیے اپنے کارکنان کے علاوہ دوسرے طبقات کی آراء کو بھی مشاورتی عمل سے گُزارے تا کہ ہماری پالیسی ہر طرح کے سُقم سے پاک ہو۔ پلاننگ کرنے اور حکمتِ عملی ترتیب دے لینے کے بعد حتمی منظوری سے پہلے اس پر تفصیلی بحث کروائی جائے، تجاویز، تبصرے اور مزید بہتری کے لیے ارکان میں اوپن ڈسکشن کرائی جائے اور خُوب شرح صدر ہو جانے کے بعد ایک جامع پالیسی تشکیل دی جائے اور پھر دس پندرہ سال یا اہداف کے حصول تک اس پر یکسُو ہو کر کام کیا جائے۔ میری دانست میں پلاننگ فیز ۶ ماہ بھی چلتا رہے تو کوئی حرج نہیں لیکن اس بار یہ طے ہو کہ ہم اندرونی اصلاحات کر کے رہیں گے۔

تاریخ میں حالات کا رُخ بدلنے میں نوجوان لِیڈرشپ کا فیصلہ کُن کردار رہا ہے۔ سیدنا

اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی اور تاریخ کی کئی دیگر شخصیات کا مُطالعہ کرلیں کہ اُنہوں نے اپنی عُمر کے کس حصے میں کیا کیا کارہائے نُمایاں سرانجام دیے۔

ہر سطح پر کم فہم اور سُست لوگوں کو فارغ کریں، اوسط ذہنی سطح کی ناکارہ لیڈرشپ کی بجائے یونین کونسل، زون، شہر، ضلعی اور صوبائی و مرکزی سطح پر جدید دور کے چیلنجز سے نپٹنے والی نوجوان قیادت سامنے لائی جائے۔

میچوریٹی یا ذہنی پختگی کا تعلق عُمر رسیدہ ہونے سے نہیں بلکہ مُطالعہ، تعلق باللہ، فکری بالیدگی، حالاتِ حاضرہ پر نظر اور قوتِ فیصلہ سے ہوتا ہے۔ ہم شہر، ضلع یا صُوبائی امیر لگانے کے لیے اُس کے بالوں کی سُفیدی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ جماعت کی پالیسیاں جس نہج پر چل رہی ہوتی ہیں بندہ اپنے آپ سے چومُکھی لڑائی لڑتے لڑتے اور عُمر کے اُس پہر تک پہنچتے پہنچتے ویسے ہی ذہنی طور پر تھک چُکا ہوتا ہے اور کسی قدر مایُوس بھی ہوجاتا ہے۔

جماعت اپنے ارکان کے لیے ایسے بریفنگ سیشنز کا انتخاب بھی کرے جن میں ارکان کو ممبرانِ شُوریٰ کے انتخاب کی اہمیت اور بہترین افراد کی سلیکشن کی ضرورت پر رہنمائی دی جائے۔ فیصلہ سازی کا فورم جس قدر باصلاحیت اور مؤثر ہوگا جماعت کی مجموعی کارکردگی اُتنی ہی بہتر ہوجائے گی۔

عمومی طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کوئی امیرِ ضلع یا قیم یا مشہور لیڈر رُکنِ شُوریٰ منتخب نہیں ہوسکا تو اُسے بعدازاں نامزد رُکنِ شُوریٰ کے طور پر شُوریٰ میں لے لیا جاتا ہے۔ یہ روایت ختم کرکے اگر مجلسِ شُوریٰ کی تیس فیصد نشستیں ارکان میں سے مُختلف امور کے ماہرین، برادر تنظیمات اور بیرونِ مُمالک حلقہ جات مثلاً اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ یا دیگر کے لیے مُختص کردی جائیں تو فیصلہ سازی کے فورم میں تحریک کے سبھی طبقات کی نُمائندگی بھی ہو جائے گی اور بہت سے وسیع النظر اور قابل افراد ہمارے فیصلہ سازی کے فورم کا حصہ بھی بن جائیں گے۔ ہر مَنصب پر بہترین اور باصلاحیت افراد کی تعیناتی سے ہی تنظیم اور اس کے اداروں کو کارکردگی کا بہترین ماڈل بنایا جاسکتا ہے۔

فرد اور معاشرے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر پلاننگ کریں۔ یہ سوال سب سے اہم ہے کہ ہم کیسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں؟ معاشرے کے مختلف طبقات کے مسائل اور تقاضے مختلفہیں۔ ان سب کو اچھی طرح سمجھ کر ان سب کی مدد سے ایک مثبت معاشرے کی تشکیل میں ہم کیسے ایک مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں؟ یہ واضح رہے کہ اسلامی انقلاب ہمارا مطمحِ نظر تو ہو سکتا ہے لیکن معاشرے کا مُطالبہ نہیں۔ ہمیں ایک مُسلم معاشرے اور دار الکُفر میں کام کے فرق کو سمجھنے کی بھی ازسرِ نَو ضرورت ہے۔

معاشرے کی ترجیحات کو سمجھ کر جب تک ہم اپنے قائدانہ کردار کا تعین نہیں کریں گے تب تک ہمیشہ دریا کے ایک کنارے پر ہم اور دُوسرے پر معاشرہ ایک دوسرے کو حیرت زدہ تکتے رہیں گے۔

عوام ہمارے اسلامی انقلاب کے فلسفے پر جَلد یا بدیر کبھی نہیں آئیں گے۔ ایک مثبت اور محفوظ مُعاشرے کی تشکیل کو ٹارگٹ کر کے محنت کی جائے تو یہ نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

ہمیں اِس خوش فہمی سے نکلنا ہو گا کہ ہم مُعاشرے سے بہت بہتر لوگ ہیں۔ یہ سوچ تعَلّی، خودستائشی اور تکبر کے زُمرے میں آتی ہے اور یہی سوچ ہمیں عوام میں گُھلنے مِلنے نہیں دیتی۔ اس کی بجائے اگر ہم یہ سوچ اپنائیں کہ معاشرے میں ہم سے بہت بہتر لوگ بھی موجود ہیں لیکن ہماری یہ اضافی ذمہ داری ہے کہ ہم اس معاشرے کو ایک بہتر معاشرہ بنانے کے لیے ان لوگوں کو احساس دلائیں، اپنے ساتھ جوڑیں، مُنظم کریں اور ایک بہتر، مثبت اور محفوظ مُعاشرے کی تشکیل کے لیے مل کر اپنا کردار ادا کریں۔ صرف سوچ کا زاویہ بدلنے سے ہی جدوجہد کی سمت اور نتائج مختلف ہو سکتے ہیں۔

معاشرے کے مختلفطبقات کی مثبت اور محفوظ مُعاشرے کی تشکیل میں معاونت اور ورکنگ ریلیشن شِپ قائم کرنے کے لے سوسائٹی کے مُختلف طبقات اور دانشوروں پر مُشتمل ڈِسکشن فورمز تشکیل دیے جائیں۔ میڈیا میں موجود ہمارے لوگ اس محاذ کو سنبھالیں۔ سیکولر دانشوروں کی اکثریت [چند ایک کو چھوڑ کر] مُسلمان ہی ہے اِن کو مجموعی طور پر بے دین سمجھنا غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ دین سے بیزار نہیں بلکہ دینداروں کے کردار اور رویّوں کے ناقد ہیں۔

باہمی احترام، رواداری، برداشت، تہذیب وشائستگی اور دلیل سے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار وہ مشترکہ نُکات ہو سکتے ہیں جن پر معاشرے کے تمام طبقاتِ فِکر اکٹھے ہو کر ایک مُتفقہ ضابطۂ اخلاق ترتیب دیں اور اِس پر عمل کریں تو مُعاشرے کو عدم برداشت کے نُقصانات سے بچایا جا سکتا ہے۔ عدم برداشت جِس درجہ کو پہنچ چُکا ہے اس کا مُظاہرہ حالیہ الیکشن کمپین میں سوشل میڈیا پر ہم سب دیکھ چُکے ہیں۔ مثبت معاشرے کی تشکیل میں ڈاکٹرز، وکلاء، تعلیمی اداروں کے سربراہان، اساتذہ وغیرہ کو بھی ساتھ مِلا کر اسے ایک مُلک گیر تحریک کی شکل دی جا سکتی ہے۔

ایلیٹ کلاس کو فوکس کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے بارے میں خواہ مخواہ یہ گُمان رکھنا کہ یہ لوگ دین بیزار ہیں ایک غلط گُمان ہے اور بدگمانی از خود ایک گُناہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ جس ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اُسی تہذیب وثقافت کو اپنا لیتے ہیں۔ ان لوگوں کے قریب ہونے اور ان میں مثبت مُعاشرے کا شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ پلٹ جائیں تو معاشرے میں مثبت تبدیلی کے لیے ہم سے زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ نوجوان نسل میں کام کے لیے پہلا مرحلہ اجنبیت کے خاتمے کا ہے۔ اس کے لیے ان کی عُمر کے مطابق گلی محلوں اور رہائشی آبادیوں کی سطح پر کِڈز کلب، سپورٹس کلب، ٹورازم اینڈ ایڈونچر کلب، موٹر سائیکلنگ کلب، اور سوشل سروس کے کلب بنائیں تاکہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گُزارنے کا موقع مِل سکے۔ ان بچوں، طلبہ وطالبات اور نوجوانوں کی تربیت کے لیے ٹھنڈے مزاج کے ایسے نوجوانوں کا انتخاب کیا جائے جو خوش مزاج اور ہنس مُکھ ہوں، نظریاتی طور پر یکسُو ہوں، علمی اور فکری طور پر مضبوط ہوں، مُستقل مزاج ہوں، دھیمے لہجے اور دھیرے دھیرے تربیت کے مدارج طے کرنے پر یقین اور عمل کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ زندگی بھر کے تعلق کی اہمیت سے واقف ہوں۔ (دانش ڈاٹ کام)

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء نون الف

جماعت اسلامی کی شکست۔دل ہے کہ مانتا نہیں

۲۰۱۸ء کے عام انتخابات میں اسٹیبلشمنٹ کی جانب سے جو کھیل کھیلا گیا' اُس پر اقتدار میں آنے والی تحریک انصاف کے سوا سب ہی تذبذب میں ہیں۔ جماعت اسلامی' جو ۲۰۱۳ء کے انتخابات کے بائیکاٹ کی وجہ سے پہلے ہی خاصی حد تک انتخابی عمل سے باہر جا چکی تھی' مگر پھر بھی اپنے نظریے اور کارکنان کی انتھک محنت اور مسلسل میدان میں رہنے کے باعث کم از کم اجنبی نہیں تھی۔

اب جب کہ نتائج آ چکے ہیں اور انتقالِ اقتدار کا عمل اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے، جماعت اسلامی کے اندرونی و بیرونی حلقوں میں انتخابات میں ناکامی کے حوالے سے باتیں ہو رہی ہیں۔ چنانچہ عام انتخابات کے فوری بعد جماعت اسلامی نے پہلے مرکزی مجلس عاملہ پھر وسیع تر مشاورت کے لیے مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد کیا جس میں انتخابی نتائج اور ملک کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ اجلاس میں ۲۵ جولائی ۲۰۱۸ء کے عام انتخابات کو غیر شفاف، غیر جانب دارانہ اور غیر منصفانہ قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ الیکشن کمیشن کی بہت بڑی ناکامی ہے جو انتہائی افسوس ناک ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے اپنی پسند کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے سیاست و انتخابات میں مداخلت تو کسی نہ کسی انداز میں ماضی میں بھی ہوتی رہی ہے۔لیکن انتخابات ۲۰۱۸ء کے مطلوبہ نتائج کے لیے گزشتہ کئی سال سے ان کی واضح اور ہر کسی کو نظر آنے والی مداخلت ہوئی ہے' جو ملک و قوم کے لیے ہی نہیں' خود اداروں کے لیے بھی انتہائی نقصان دہ ہے۔

اور پھر ''مطلوبہ نتائج'' کے آتے ہی امریکا اور پڑوسی ملک بھارت کی طرف سے پاکستان میں دینی جماعتوں کی شکست پر آنے والے بیانات نے یہ واضح کر دیا ہے کہ دینی جماعتوں کے خلاف دھاندلی کے اس کھیل میں ملکی کے ساتھ ساتھ عالمی اسٹیبلشمنٹ بھی شامل تھی۔ اس منظر نامے کے ساتھ جماعت اسلامی پاکستان نے دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر

پارلیمنٹ کے اندر اور باہر احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر ساتھ ہی جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ برسر اقتدار حکومت کے ساتھ جہاں ہم نیکی و تقویٰ اور قومی سلامتی کے کاموں پر تائید و تعاون کریں گے، وہیں برائی، بے حیائی اور فحاشی کی ڈٹ کر مخالفت کریں گے۔

مرکزی مجلس شوریٰ نے کارکنان کی رائے اور تجاویز لینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا ہے اور ایک چار رکنی کمیٹی کے قیام کا اعلان بھی کیا ہے۔ یہ کمیٹی دعوت و تربیت اور تنظیم کے حوالے سے کام کرے گی کہ کون سی کون سی تبدیلیاں لازم ہیں؟ دعوت اور تربیتی نظام کو کس طرح وسعت دی جائے؟ تنظیم اور دستور میں کس حد تک تبدیلی ممکن ہے؟

کہتے ہیں کہ ''ہار ہمیشہ یتیم ہوتی ہے اور جیت کے کئی باپ ہوتے ہیں۔'' آج کارکنان جماعت اسلامی میں دبے اور کھلے لفظوں میں ہونے والی گفتگو میں یہ سوال سرفہرست ہے کہ ''کیا وجہ ہے کہ جماعت اسلامی کو کامیابی نہیں مل رہی؟'' ہر چند کہ اس سوال کے جواب میں بے شمار تقاریر اور مقالے موجود ہیں مگر اس کے باوجود ''دل ہے کہ مانتا نہیں''، مسلسل ناکامیاں اپنے ساتھ ہمیشہ شکوک و شبہات اور بددلی کا طوفان بھی لاتی ہیں اور قیادت پر بھی کئی سوالیہ نشان چھوڑ جاتی ہیں۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات، جس میں جماعت اسلامی نے اپنی سیاسی انتخابی تاریخ میں سب سے زیادہ امیدوار میدان میں اتارے تھے اور اس میں جماعت اسلامی کو چار نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی تھی اور جماعت اسلامی عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کے بعد ووٹوں کے اعتبار سے ملک کی تیسری بڑی جماعت قرار پائی تھی، جس نے کُل پڑنے والے ووٹوں کا چھ فیصد ووٹ حاصل کیا تھا، مگر اس کے بعد کی صورت حال مسلسل روبہ زوال ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ جماعت اسلامی کی قیادت کو اس بات کا ادراک نہ ہو، مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ ہماری قیادت کوئی دلیرانہ فیصلہ نہیں کرتی؟ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ ''دلیرانہ فیصلے'' سے ان کی کیا مراد ہے۔ مگر کہنے والوں کے اخلاص پر شبہے کے بغیر میں چاہوں گا کہ اس کی بھی وضاحت ہونی چاہیے کہ وہ ''دلیرانہ فیصلے'' کیا ہو سکتے ہیں؟

دنیا بھر میں موجود اسلامی تحریکوں کی کارکردگی کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہر جگہ

کے حالات اور سیاسی حکمتوں کے پیش نظر کچھ ''آوٹ آف دی باکس'' فیصلے کیے گئے جن کی بدولت ان ممالک میں اسلامی تحریکوں کو عوام میں قبول عام حاصل ہوا۔ اب اس قسم کے تجربات کا مطالبہ ہماری قیادت سے بھی کیا جانے لگا ہے۔

ترکی، مصر، الجزائر، سوڈان اور تیونس وغیرہ میں تحریک اسلامی نے حکمت کے تحت اپنے کام کا نہ صرف باریک بینی سے جائزہ لیا بلکہ طریقۂ کار میں اہم تبدیلیاں بھی لے کر آئے۔ یہاں تک دیکھنے میں آیا ہے کہ بنیادی تحریک اسلامی سے علیحدہ پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیا گیا (جس کی بڑی اور کامیاب مثال ترکی ہے) ان تمام تحریکوں کو جس حد تک بھی کامیابی حاصل ہوئی ہے اس میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان تحریکوں نے اپنی ''بنیادی تحریک اسلامی'' سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے کام کے نئے راستے تلاش کیے۔

مصر میں امام حسن البنا کے دور کی اخوان اپنی ''لڑائی'' اور ٹکراؤ والی پالیسی کی وجہ سے شدید مشکلات سے دوچار رہی'' چنانچہ بنیادی تبدیلی لائی گئی اور حکومت میں حصہ داری اور مرکزی سیاسی جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کی پالیسی ترتیب دی گئی مگر جب یہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہوئی تو پھر وہی پرانی مخالفانہ ڈگر نے اخوان کو ایک مرتبہ پھر مشکلات سے دوچار کر دیا۔ بنگلہ دیش میں بھی حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنے کا تجربہ کیا گیا، جہاں حسینہ واجد کی حکومت کی طرف سے جماعت اسلامی پر بڑھتے ہوئے جبر اور نمایاں رہنماؤں کی گرفتاریوں اور پھانسیوں کے بعد جماعت اسلامی دوبارہ مشکل میں گھرتی چلی گئی۔ حکمت عملی تبدیل کرنے کی ایک مثال تیونس کی ''النہضہ'' نے پیش کی ہے۔ تیونس کی اسلامی تحریک نے شدت پسندی سے دور رہتے ہوئے اپنے کام کو آگے بڑھایا' یہاں تک کہ انتخابی مہم میں اعلان کیا کہ ''اسلام ہمارا بنیادی نعرہ نہیں ہے۔''

تیونس کے حوالے سے رسالہ ''النہضہ'' میں، جو راشد الغنوشی کی سرپرستی میں نکلتا ہے' تحریکِ اسلامی کا یہ تجزیہ آیا ہے کہ تیونس میں صبر سے کام لینے کے بجائے حکومت سے لڑنے کا ارادہ بالکل غلط تھا۔ اگر ہم حکومت کی اذیتوں کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے تو بعد کے حالات سے ہم ملک کو بچا سکتے تھے۔ (جس میں وہاں تحریک کے لیے کام کرنا عملاً ناممکن بنا دیا

گیا۔)

اب جب کہ مسلسل تیزی کے ساتھ نیچے آتے گراف کو دیکھتے ہوئے جماعت اسلامی کے قائدین کو اس بات کا ادراک ہو چکا ہے کہ عالمی اسٹیبلشمنٹ کسی بھی طور جماعت کو کامیاب نہیں ہونے دے گی تو کیا ان حالات میں جماعت اسلامی اپنے لیے کوئی بڑا فیصلہ کر پائے گی؟ ایسا نہیں ہے کہ ہماری قیادت نے دلیرانہ فیصلے نہیں کیے۔ سابق امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد مرحوم نے نوجوانوں کو ترکی کے ماڈل پر تیار کرنے کا پرگرام بنایا مگر ۱۹۹۲ء میں ''پاکستان اسلامک فرنٹ'' میں ناکامی کے بعد سارا ملبہ قاضی حسین احمد مرحوم اور ان کی بنائی ہوئی ''پاسبان'' پر ڈال دیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی شوریٰ کی اجتماعیت کا تھا، جس نے اس تجربے کو وقت سے پہلے ہی گلا گھونٹ کر ماردیا۔

پھر ''شباب ملی'' کا تجربہ ہوا' جو اپنی طبعی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔ موجودہ انتخابات سے پہلے ''جے آئی یوتھ'' کو میدان میں لایا گیا اور ان سے انتخابات میں نمائندگی کے وعدے تک ہوئے مگر دیکھا یہ گیا کہ چند ٹوکن قسم کی نشستوں پر نوجوانوں کو برائے نام حصہ ملا۔

آخر میں یہ مثال دینا بھی ضروری ہے کہ اردن کے پارلیمانی انتخابات میں جب الاخوان المسلمون کی نمائندگی ۱۷ سے کم ہو کر ص ۶ ہوگئی تو الاخوان المسلمون نے اپنی انتخابی حکمت عملی کی تیاری میں سرزد ہونے والی غلطیوں کا نہ صرف اقرار کیا بلکہ پوری مجلس شوریٰ ایک ساتھ مستعفی بھی ہوگئی تھی۔

الحمدللہ کارکنوں نے اپنے حصے کا کام پورا کر دیا ہے اور جس کے لیے کیا ہے وہی اس کا اجر بھی دے گا۔ اب یہ قیادت کا امتحان ہے کہ وہ اس بار کس قسم کا دلیرانہ راستہ اختیار کرتی ہے۔(دانش ڈاٹ کام)

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

محمد حنیف [۱]

احترام لازم ہے لیکن جماعتِ اسلامی الوداع

جماعتِ اسلامی کے امیدوار کو کتنے ووٹ ملتے ہیں دل بیٹھا سا جاتا ہے لیکن....

زندگی میں پہلا فری ہسپتال دیکھا تو اسے جماعتِ اسلامی کے ایک ڈاکٹر چلاتے تھے۔ پہلی دفعہ لائبریری دیکھی تو اس کے لائبریرین جماعتِ اسلامی کے رفیق تھے۔ زندگی میں پہلی دفعہ سکول میں کوئی کارنامہ کرنے پر انعام ملا تو وہ مولانا مودودی کی ایک کتاب تھی۔

لاہور میں ایک دوست کے دونوں ہاتھوں پر پلاسٹر چڑھا دیکھا تو اس کے ہاتھ اسلامی جمعیت طلبہ نے توڑے تھے۔ جب شروع میں صحافت سے رجوع کیا تو نام نہاد لبرل صحافیوں نے خبردار کیا کہ پاکستانی اخباروں کے نیوز روم جماعتِ اسلامی کے تربیت یافتہ سب ایڈیٹروں سے بھرے پڑے ہیں۔ بیانیہ نہ ہوا منے کا پوتڑا ہو گیا۔ ایک ڈراؤنی کہانی اگر اگر میلہ شروع مگر پنگھوڑے غائب۔

جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد کو بھٹو کی پھانسی اور حلوے کی دیگوں کی یادوں میں گم دیکھا۔ قاضی حسین احمد کو 'ظالمو قاضی آ رہا ہے! ظالمو قاضی چھا رہا ہے!' کے نعروں سے قوم کے دلوں کو گرماتے دیکھا۔ جناب منور حسن کی شوخ مسکراہٹ اور 'جمہوریت نہیں قتال چاہیے' کے جلوے دیکھے۔ حضرت سراج الحق کا ٹیلیویژن پر چھوٹا سا گھر دیکھا، ان کی ترچھی ٹوپی کا طنطنہ دیکھا۔

اگر فین بننے میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ یوں پوری ہوئی کہ سپریم کورٹ کے ججوں نے جو اپنے فیصلوں میں خلیل جبران اور گاڈ فادر کے حوالے دے کر ادبی چاشنی پیدا کرتے ہیں، فرمایا کہ اگر پاکستان کی پارلیمان میں صادق اور امین والا قانون نافذ کیا جائے تو صرف سراج الحق ہی پارلیمان میں بیٹھے نظر آئیں گے۔ فوجی آمروں کو چھوڑ کر عدالتِ عالیہ نے کسی اور کو ایسا

[۱] صحافی، تجزیہ کار

کیریکٹر سرٹیفکیٹ دیا ہے تو مجھے پتہ نہیں!

ایسی اٹھان اور ایسی شان کے بعد لاہور میں ایک ضمنی انتخاب ہوتا ہے اور جماعتِ اسلامی کے امیدوار کو کتنے ووٹ ملتے ہیں؟ احترام پیشِ نظر ہے، دل بھی بیٹھا سا جاتا ہے لیکن ۵۹۲! حضور اس سے تو زیادہ لوگ پلّے سے ٹکٹ خرید کر نسیم وکی کا ڈرامہ دیکھنے چلے آتے ہیں۔سپریم کورٹ کے ججوں کے مطابق اگر پاکستان کی پارلیمان میں صادق اور امین والا قانون نافذ کیا جائے تو صرف سراج الحق ہی پارلیمان میں بیٹھے نظر آئیں گے۔ یاد رہے کہ یہ ووٹ آپ کو لاہور شہر میں ملے ہیں جہاں پنجاب کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں نصف صدی سے جمعیت کے بھائی بگڑے ہوئے طالب علموں کی ٹانگیں توڑ کر ان کی اخلاقی تربیت کر رہے ہیں۔ جہاں ہر وقت ہر بہن کی عفت وحیا پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔اس کے بعد بھی تین لاکھ میں سے ۵۹۲ ووٹ؟ اور بازی کون لے گیا؟ دو بڑوں کو چھوڑیں۔ایک ایسا عالمِ دین جس کا نام بھی ایک سال پہلے تک کوئی نہیں جانتا تھا۔ دوسرا امیدوار ایک مایوس مجاہد جس کی جماعت ابھی بنی ہی نہیں۔احترام لازم ہے لیکن خیال آتا ہے کہ اگر مودودی مرحوم حیات ہوتے تو منصورہ میں پوری شوریٰ کے کان نہ پکڑوائے ہوتے؟ بزرگوں سے سنا ہے کہ جب مولانا مودودی نے پچاس کے عشرے میں جماعت کو ایک دینی اصلاحی تحریک سے سیاسی جماعت بنانے کا سوچا تو ان کے کچھ سینیئر ساتھی اختلاف کر کے علیحدہ ہو گئے۔مولانا نے خود بھی فرمایا کہ ان کا فیصلہ ایک لوہے کا چنا ہے جو بہرحال چبانا ہے۔گذشتہ ۶۰ سال میں جماعتِ اسلامی نے پوری قوم کے ساتھ ساتھ افغانستان کو بھی لوہے کے چنے چبوا دیے لیکن یہ انتخابی سیاست والا چنا اس کے اپنے گلے میں اٹکا ہوا ہے۔

جماعتِ اسلامی نے تربیت کر کے جن جوانوں کو پہاڑوں پر چڑھایا تھا وہ کہیں غاروں میں گھس گئے۔جنھوں نے تربیت حاصل کر کے سماج کو بدلنا تھا، انھوں نے فری ہسپتال چھوڑ کر ایئر کنڈیشنڈ اسلامی سکول کے نیٹ ورک بنا کر مال کمانا شروع کر دیا۔جنھوں نے سیاست کے میدان میں آکر اپنے کردار کی بدولت مثال قائم کرنی تھی وہ بھی پروٹوکول اور ٹھیکوں کے چکر میں آکر دوسرے بھائیوں جیسے بن گئے۔

یاد رہے کہ یہ ووٹ آپ کو لاہور شہر میں ملے ہیں جہاں پنجاب کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں نصف صدی سے جمعیت کے بھائی بگڑے ہوئے طالب علموں کی ٹانگیں توڑ کر ان کی اخلاقی تربیت کر رہے ہیں پیچھے مڑ کر دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ جماعت سے تربیت پانے کے بعد جن مشاہیر نے اپنا راستہ الگ اپنایا وہ صحیح تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی، ڈاکٹر اسرار احمد، ارشاد احمد حقانی، کیسے کیسے ہیرے جماعت نے اس ملک کو دیے۔ لگتا ہے جو جماعت سے پوری تربیت حاصل کر لیتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اسے خیر باد کہہ دے۔

احترام لازم ہے لیکن ۵۹۲ کا ہندسہ دیکھ کر دل بیٹھا سا جاتا ہے۔ کیا وہ وقت آ گیا ہے؟ مودودی صاحب نے کبھی اپنے آپ کو ولی یا پیمبر نہیں کہا۔ ہوسکتا ہے کہ ۶۰ سال پہلے کیے گئے فیصلے میں کوئی سقم رہ گیا ہو۔ آج اس ملک کو جتنے فری ہسپتالوں کی ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ غریب عوام کو جتنی مفت سکولوں کی آج ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی اور دین کی دعوت کا کام تو ابد تک جاری رہنا ہے۔ تو کیا ہی اچھا ہو کہ اگر جماعت اگلے الیکشن میں پھر ضمانتیں ضبط کروانے کی بجائے فلاحی کاموں پر توجہ دے۔ جماعت ہر سال عورتوں کے لیے یومِ حیا مناتی ہے اس سال مردوں کے لیے بھی ایک یومِ حیا کا اعلان کرے۔ (دانش ڈاٹ کام)

ہم قربانی کیوں کرتے ہیں؟

ہم نے ایک نوجوان سے پوچھا جو اپنے بکرے کی خدمت میں منہمک تھا کہ آپ قربانی کیوں کرتے ہیں؟ اس نے کہا ثواب کی خاطر۔ ہم نے کہا ثواب کے لیے تو کئی دوسری مدات بھی ہوسکتی ہیں قربانی ہی کیوں؟ وہ خاموش ہوگیا۔ ہم نے کہا جس طرح آپ بکرے کی قربانی کرتے ہیں کیا اسی طرح آپ نے کبھی اپنی ان خواہشات کی قربانی دینے کا بھی سوچا ہے جو شرعی لحاظ سے غلط یا غیر مناسب ہوں؟ تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء ’نقیبِ سحر‘

جماعتِ اسلامی ۔ قیادت کی پھرتیاں

جماعتی قیادت کا اپنی شکست کو دھاندلی کے نعروں کی گرد میں چھپانا اور خود مستعفی ہونے کی بجائے تنقید کرنے والے ارکان کو جماعت سے نکال باہر کرنا کیا دھاندلی نہیں ہے؟

اخلاص اور اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی جو کام کرے، جو پالیسیاں وضع کرے ان کے نتائج کو بھی قبول کرے۔ محترم سراج الحق صاحب جب سے امیر جماعت بنے ان کا ایک ہی فوکس تھا کہ ہم نے ۲۰۱۸ء کے انتخابات جیتنا ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے اندرون ملک و بیرون ملک تفصیلی دورے کیے۔ وہ ایک ایک جگہ گئے، کروڑوں روپے جمع کرنے کا ٹارگٹ اپنے لوگوں کو دیا کہ ہم نے ہر قیمت پر ۲۰۱۸ء کے الیکشن جیتنے ہیں۔ پھر الیکشن جیتنے کے لیے انہوں نے مولانا فضل الرحمن کے ساتھ اتحاد کیا اور خوب بھاگ دوڑ کی اور جب انتخابات میں بری طرح ہار گئے تو اپنی پالیسیوں کی ناکامی کا اعتراف کرنے کی بجائے اور اپنی شکست تسلیم کرنے کی بجائے اپنی شکست کا ذمہ دار خلائی مخلوق کو گرداننے لگے۔

خود جماعت کے اندر یکسوئی کی کیفیت یہ تھی کہ ایک رکن جماعت سراج الحق صاحب مقابلے میں دِیر سے کھڑے ہوگئے جنہیں بڑی مشکل سے بٹھایا گیا۔ مولانا فضل الرحمن صاحب سے مفاہمت کے نتیجے میں ان کی جماعت کی حمایت بھی انہیں حاصل تھی لیکن اس کے باوجود وہ دِیر سے ہار گئے جس کا مطلب یہ ہے کہ خود ان کے حامیوں نے انہیں ووٹ نہیں دیے۔ اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کی بجائے انہوں نے دیر کی جماعت کے لوگوں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا ہے اور اخباری اطلاعات کے مطابق خیبر پی کے میں ۲۰ کے قریب ارکان کو جماعت سے نکال دیا گیا ہے اور مزید کے خلاف کارروائی جاری ہے۔

اخلاقیات کا تقاضا یہ ہے کہ انتخابات کو اقامت دین کا واحد ذریعہ سمجھنے والی قیادت اپنی پالیسیوں کی ناکامی پر مستعفی ہوجائے۔ ارکانِ جماعت کا اجتماعِ عام بلایا جائے اور کھلی بحث وتمحیث کے بعد جماعت کی پالیسی از سر نو وضع کی جائے اور نئی قیادت منتخب کی جائے تا کہ اہلِ جماعت یکسوئی سے اقامت دین کے لیے کام کرسکیں۔ اگر جماعتی قیادت یہ نہیں کرتی اور دستوری مرکزیت کو بنیاد بنا کر اختلافِ رائے رکھنے والے ارکان کو کچلنے کی آمرانہ اور مستبدانہ پالیسی جاری رکھتی ہے تو مظلوم ارکان جماعتی قیادت کو ’مافیا‘ قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے۔

پاکستان اور اسلام / انتخابات ۲۰۱۸ء

ابوالحسن علوی

جماعت اسلامی کی صورتِ حال اور مستقبل کے لیے تجاویز

پچھلی صدی کی چالیسویں دہائی میں بیسوی صدی کی عظیم اسلامی تحریک نے جنم لیا جسے ۱۹۴۱ء سے جماعت اسلامی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک کی پشت پر دل نشین اور سائنسی انداز میں لکھا گیا دینی لٹریچر اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی عظیم شخصیت کے ساتھ ہندوستان کے نامور اور جید علماء کی قیادت حاصل تھی۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جماعت اسلامی نے ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد شروع کی۔ قراردادِ مقاصد اور علماء کرام کے متفقہ ۲۲ نکات اس کا فوری ثمر تھے۔ ماچھی گوٹھ کے جماعت کے اجتماع عام میں انقلاب بذریعہ انتخابات کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ایک اجتہادی فیصلہ تھا۔ اختلاف کرتے ہوئے متعدد جید علماء کرام جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئے۔ اس عظیم تحریک کو یہ پہلا بڑا دھچکا تھا لیکن مولانا مودودیؒ کی ٹھوس علمی اور تنظیمی قیادت نے اس دھچکے کو جذب کر لیا اور تحریک اسلامی کا قافلۂ سخت جان رواں دواں رہا۔ کئی جانگسل مراحل آئے لیکن سفر جاری رہا۔ جماعت کی سوشلزم اور کمیونزم کے خلاف جامع جدوجہد شوکت اسلام کے جلوسوں تک آ پہنچی اور ملک کے قیام کے ۲۳ سال بعد ایسی فضا بنتی نظر آئی کہ جیسے اسلامی انقلاب ملک کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کا غلغلہ برپا ہوا۔ اس الیکشن میں جنرل یحییٰ کی قیادت میں برادران عزیز نے ایسی بھٹی لگائی کہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمن اور مغربی پاکستان میں زیڈ اے بھٹو لیڈر بن کر اُبھرے۔ دونوں کی ضد اور تیسرے یعنی یحییٰ خان کی بے بصیرتی نے ملک دولخت کر دیا۔ جماعت اسلامی اور دیگر اسلامی قوتوں کی جدوجہد خاک میں ملادی گئی۔ مولانا مودودیؒ سخت مایوس ہوئے۔ ماچھی گوٹھ کی اجتہادی غلطی کو تسلیم کیا اور شوریٰ کے اجلاس میں 'اصل کی طرف واپسی' (Back to Basics) کی تجویز پیش کی لیکن اب تک شوریٰ کے اکثر ارکان کو الیکشن فوبیا ہو چکا تھا لہٰذا تجویز قبول نہ ہوئی اور مولانا خاموش ہو گئے۔

الیکشن فوبیا، جو بعد میں الیکشن مافیا کی شکل اختیار کر گیا، اپنا جلوہ ہر الیکشن میں دکھاتا رہا

اور جماعت اسلامی کی بے توقیری کے ساتھ اسلام کی بے توقیری بھی ہوتی رہی۔ اب چونکہ الیکشن ہی مطلوب ومقصود بن چکا تھا لہٰذا اتحادوں کی سیاست چل پڑی۔ اب الیکشن میں کامیابی نہ ہوئی تو پاکستان اسلامک فرنٹ ایجاد کیا گیا جس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی جیتی اور جماعت اسلامی کے بہت سے ارکان اور کارکن جماعت سے لاتعلق ہوگئے بلکہ مسلم لیگ کی طرف خاموش سفر کر گئے۔ مذہبی جماعتوں کے اتحاد کو کام میں لاکر متحدہ مجلس عمل کا تجربہ کیا گیا۔ جنرل پرویز مشرف کی پشت پناہی بھی گئی۔ ۱۷ویں آئینی ترمیم میں حصہ ڈالا گیا۔ خیبر پختون خواہ کی حکومت بھی ملی لیکن کارکردگی صفر رہی بلکہ دوسری بڑی پارٹی کی مبینہ کرپشن کا بوجھ بھی اٹھانا پڑا۔ سینئر وزیر محترم کے بسوں میں سفر کے ڈرامے بھی سامنے آئے۔ حکومت بدلنے کے بعد اٹھارہویں آئینی ترمیم میں بھی جماعت نے اپنا حصہ ڈالا جس سے وفاق کمزور ہوا اور صوبے بے لگام ہوئے۔ شعبۂ تعلیم کے حساس پہلو یعنی نصاب، کتاب وغیرہ بھی قومی سے صوبائی بن گئے۔ اس سے جماعت اسلامی کے باشعور اور باخبر حلقے مایوس ہوئے۔ پروفیسر ابراہیم صاحب جو اس سارے عمل میں شامل رہے اب بھی کہتے ہیں کہ ہم نے نصاب اور کتاب کو صوبائی بنا کر ٹھیک کیا ہے جب کہ جماعت اسلامی بلکہ مسلم لیگ بھی اس فیصلے سے خوش نہیں ہے۔ پچھلے دور میں اہل جماعت تحریک انصاف کے حکومتی حلیف رہے اور مسلم لیگ کی قیادت کو گالیاں دی جاتی رہیں۔ اب وہ مسلم لیگ کے ساتھ اپوزیشن میں حلیف ہیں اور تحریک انصاف کو دھاندلی کے الزامات دیے جارہے ہیں۔

تاریخی طور پر جماعت اسلامی فوج کے ساتھ کھڑی رہی اور اب الیکشن میں اس کی مداخلت کے الزامات دیے جارہے ہیں۔ پالیسی کے ان تضادات، مستقل مزاجی کے فقدان اور ہارنے کے لیے بلکہ ضمانتیں ضبط کرانے کے لیے ہر حالت میں الیکشن میں حصہ لینے کے عمل نے ارکان جماعت کو شدید صدمے سے دوچار کردیا ہے۔ جماعت کے مرکزی قائدین میں الیکشن فوبیا کی مرضی اتنی بڑھ چکی ہے کہ امیر محترم سراج الحق صاحب سینیٹر ہوتے ہوئے بھی قومی اسمبلی کی سیٹ کے لیے الیکشن میں کود پڑے اور مولانا مودودیؒ کی مسند کو، جس پر وہ براجمان ہیں، بے توقیر کیا۔ پچھلے بلدیاتی الیکشن میں دو مرکزی ذمہ داران یعنی لیاقت بلوچ صاحب اور فرید پراچہ صاحب نے اپنے فرزندان کو بالترتیب مسلم لیگ ن اور تحریک انصاف

سے ٹکٹ لے کر کھڑا کیا اور ناکامی کی رسوائی حاصل کی۔ ادھر جماعت اسلامی کے قائدین کے بیانات، اخباروں میں خوبصورت فوٹو کوریج اور شوریٰ کے حالیہ فیصلوں کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیاقت بلوچ صاحب، راشد فہیم صاحب اور قاضی آصف لقمان صاحب جو پہلے بھی سیاسی حکمت عملی طے کرنے کے اصل ذمہ دار ہیں اور الیکشنوں میں ہارنے کی ہَیٹ ٹِرک کر چکے ہیں انہیں نئی سیاسی حکمت عملی وضع کرنے کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے۔ ان حضرات کی نیت پر شک کرنا تو شاید ممکن نہیں لیکن ان کے وژن، اصابت رائے اور سوچ کے معروضی ہونے پر تو سوالیہ نشان لگایا جا سکتا ہے۔ گویا ہم جن کے سبب بیمار ہوئے ہیں انہی صاحبانِ اقتدار سے الیکشن فوبیا کے مرض سے شکار کے لیے دوا لینا چاہتے ہیں۔ یہ خبر بھی سننے میں آئی ہے اور مصدقہ ہے کہ کچھ لوگوں کے سامنے امیر محترم جناب سراج الحق صاحب نے فرمایا کہ اگرچہ جماعت اسلامی کے امیدواران ہارے ہیں لیکن شکر کا مقام ہے کہ تحریک انصاف جیتی ہے کیونکہ تحریک انصاف کا ایجنڈا ہمارا ہی ایجنڈا ہے۔ ہمیں نام سے غرض نہیں کام سے غرض ہے اور اب ہمارا کام تحریک انصاف مکمل کرے گی۔ ہم اس کی مکمل پشت پناہی کریں گے، نہ اُسے گرنے دیں گے اور نہ ہی اس ایجنڈے سے ہٹنے دیں گے۔

جماعت اسلامی دینی سیاسی جماعت ہے لیکن اب یہ دینی نہیں بلکہ صرف سیاسی جماعت بن کر رہ گئی ہے۔ دینی جماعت کی قیادت تو دینی اہلیت رکھنے والے ہی کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ اس وقت لے دے کر ایک مولانا عبدالمالک ہی رہ گئے ہیں جو اپنی صحت اور کبر سنی کے سبب قیادت کرنے سے قاصر ہیں۔ دعوت و تربیت اور تنظیم کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی ہے اُس سے بھی انقلابی فیصلوں کی توقع نہیں۔ بیسویں صدی کی عظیم اسلامی تحریک کے ارکان و کارکنان کی تربیت، اس تحریک کی دعوت اور تنظیمی ڈھانچے کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے ان بزرگوں کے ہاتھوں کسی بہتری کی توقع عبث ہوگی۔ کرپشن ختم کرنے کے لیے قائدین جماعت اسلامی نے ہر طرف جھنڈے لہرا رکھے ہیں لیکن اضلاع میں جو کہانیاں ہیں، منصورہ ہسپتال کے اہل کاروں کی جو لوٹ مار ہے اور منصورہ کے ڈرائیوروں کے خرد برد کے جو قصے ہیں اللہ کرے سب غلط ہوں لیکن اس طرف توجہ تو دینی چاہیے، پیشتر اس کے کہ ہم دوسروں کی کرپشن کے خلاف جہاد کریں۔

حکومت کے سیکو یٹریوں، ڈپٹی کمشنروں کی طرح تحریک اسلامی کے عمائدین کی ہر سال نئے ماڈل کی گاڑیاں بھی اندرونی لوگ دیکھتے ہیں اور چونکہ کچھ کہہ نہیں پاتے اس لیے لاتعلق ہوجاتے ہیں۔ مزید بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن شاید مناسب نہ ہو۔ ہماری تجویز ہے اور جیسا کہ خیبر پختون خواہ کے بعض جماعتی حلقے مطالبہ کررہے ہیں کہ مرکزی ذمہ داران اور تمام صوبوں کے ذمہ داران فوراً استعفیٰ دیں۔ عبوری طور پر کام چلانے کے لیے ہر سطح کی شوریٰ تین رکنی ایڈ ہاک کمیٹی تشکیل دے جو مرکز اور صوبوں کے لیے الیکشن تک نظم چلائے۔ الیکشن سے فی الحال توبہ کی جائے، اتحادوں کی سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا جائے، افراد سازی کا عظیم تربیتی کام شروع کیا جائے۔ تمام وسائل تعلیم اور تربیت پر لگادے جائیں۔ ضلعوں سے لے کر مرکز تک اور شعبہ جات کا آزاد آڈیٹرز سے آڈٹ کرایا جائے اور احتساب کا حقیقی نظام سب سے پہلے جماعت میں قائم کیا جائے۔

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی!

پاکستان اور اسلام / انتخابات ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر محمد امین

جماعت اسلامی کے دونوں کمیشنوں کے لیے چند تجاویز

بنیادی حکمت عملی پر نظر ثانی

ہماری تجویز یہ ہے کہ جماعت اسلامی اقامت دین کے طریق کار کے حوالے سے اپنے بانی مولانا مودودیؒ کے ۱۹۷۵ء کے نظر ثانی شدہ موقف کے مطابق 'قیام اسلامی حکومت بذریعہ اصلاح فرد و معاشرہ' کی طرف مراجعت کر جائے۔

وضاحت

۱۔ قیام پاکستان سے پہلے جماعت اسلامی دعوت و اصلاح کی ایک جماعت تھی جس کا نعرہ یہ تھا کہ 'قرآن وسنت کی دعوت لے کر اٹھو اور دنیا پر چھا جاؤ'۔ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ میں ''اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'' کے موضوع پر تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت فرد اور معاشرہ کی اسلامی اصولوں پر اصلاح کے منطقی نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد عوام کے اسلامی جذبات اور مسلم لیگ کے اسلامی وعدوں کے پیش نظر مولانا نے سوچا کہ شاید سیاسی جدوجہد سے اسلامی ریاست کے قیام کی منزل حاصل کی جا سکے۔ تاہم اس کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے مولاناؒ نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم اس طریقے سے (یعنی براہ راست سیاسی جدوجہد کے ذریعے) اسلامی ریاست قائم نہ کر سکے تو ہم واپس اپنے پہلے منہج (یعنی قیام اسلامی ریاست بذریعہ اصلاح فرد و معاشرہ) کی طرف لوٹ جائیں گے۔ [ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء و اسلامی ریاست، ص ۷۴۰-۷۴۲ طبع اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۶۷ء]۔

پھر جب ۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی نے انتخابات میں حصہ لیا اور بھرپور شکست کھائی تو مولانا نے دسمبر ۱۹۷۵ء میں جماعت کی شوری سے خطاب کرتے ہوئے سیاسی انتخابی جدوجہد پر نظر ثانی اور قیام پاکستان سے پہلے کی دعوت و اصلاح کی پالیسی کی طرف مراجعت کی رائے دی لیکن اس وقت کی شوری اور جماعتی قیادت نے یہ رائے تسلیم نہ کی۔ مولانا بیمار،

بوڑھے اور کمزور تھے لہٰذا خاموش ہوگئے اور بعد میں راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ اس کے بعد سے جماعت اسلامی انتخابی سیاسی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے لیکن اسے کبھی بھی کامیابی نہیں ملی اور اس کا ووٹ بنک سکڑتا سکڑتا تقریباً معدوم ہوگیا ہے۔ مولانا کے نظرثانی شدہ موقف کے شواہد ودلائل ہم نے کئی دفعہ البرہان میں شائع کیے ہیں۔ دیکھیے خصوصاً شمارہ نومبر ۲۰۱۷ء جس کے مندرجات بطور ریڈی ریفرنس ضمیمہ ① میں لف ہذا ہیں۔

۲۔ ہماری رائے میں یہ مراجعت دائمی ہونی چاہیے یعنی جماعت اُس وقت تک اصلاحِ فرد ومعاشرہ کا کام کرتی رہے جب تک کہ اس کی مجوزہ ’اسلامی حکومت‘ قائم نہ ہوجائے۔ بلکہ جماعت اس کے بعد بھی اُس اسلامی حکومت کی بقاء واستحکام کے لیے اصلاحِ فرد ومعاشرہ کی اپنی جدوجہد جاری رکھے۔

۳۔ ہماری رائے میں یہ مراجعت ناگزیر ہے اور جماعت کے مسئلے کا واحد حل ہے کیونکہ فرض کیجیے (اگرچہ ہمارے نزدیک اس مفروضے میں ۵ فیصد بھی جان نہیں) موجودہ حالات میں جماعت اسلامی انتخابات جیت بھی جاتی ہے تو کیا پاکستان کی موجودہ فوج، موجودہ عدلیہ، موجودہ میڈیا اور سیکولر سیاسی جماعتیں اور لبرل حلقے اور ان کی پشت پر کھڑے مغربی فکروتہذیب کے علمبردار طاقتور ممالک (امریکہ ویورپ اور ان کے حلیف اسرائیل، بھارت.... بلکہ حلیف مسلمان ممالک [جیسے مصر میں صدر مرسی کے اقتدار کے خاتمے کے لیے سعودی عرب نے معاونت کی] اسے حکومت کرنے دیں گے؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ مراجعت اقامتِ دین کا واحد حل ہے۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ جماعت کو کسی فکری نظرثانی کی ضرورت نہیں، اس کی فکر صحیح ہے اور ضرورت صرف اس فکر کے اندر رہتے ہوئے سیاسی حکمت عملی کو تبدیل کرنے اور مؤثر بنانے کی ہے، تو ہماری رائے میں ان کی یہ فکر خام اور سطحی ہے۔ ’سٹیٹس کو‘ پر یہ اصرار اور ۷۰ سال کی شکستوں کے باوجود اپنا احتساب نہ کرنا، اپنا تنقیدی جائزہ نہ لینا اور اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی نہ کرنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔ اس کی مثال اس کھڑے پانی کی سی ہے جو زیادہ عرصہ گزرنے پر بُو دینے لگتا ہے۔

۴۔ **متبادل سیاسی لائحہ عمل:** تاہم جماعت چونکہ پچھلے ۷۰ سال سے سیاسی جدوجہد

کررہی ہے اور بہت سی مسلکی جماعتیں بھی عرصے سے سیاسی جدوجہد کررہی ہیں اوران سب کی کوششوں کا نتیجہ صفر نکلا ہے۔ نیز موجودہ حالات میں مستقبل قریب میں ان سب 'دینی سیاسی جماعتوں' کی جدوجہد کامیاب ہونے کا امکان نظرنہیں آتا لہٰذا متبادل سیاسی لائحہ عمل پر غور ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی گنجائش موجود ہے اوروہ یہ ہے:

ایک ایسی سیاسی جماعت بنائی جائے جو غیر مسلکی ہو، جس کا چہرہ دینی نہ ہو لیکن اس کے مقاصد واہداف دینی ہوں اور قیادت اس میں مخلص ہو۔ جماعت اسلامی پیچھے رہ کر اس طرح کی جماعت کا آغاز کرے لیکن اس پر جماعت اسلامی کی چھاپ نہ ہو (جس طرح کہ اسلامی جمعیت طلبہ، تنظیم اساتذہ اور جمعیت اتحادالعلماء وغیرہ پر ہے)۔ جماعت کا کوئی معروف آدمی اس کا لیڈر نہ ہو اور اس میں ہر مسلک کے اور ہر شعبۂ حیات کے لوگ شامل ہوں۔ یہ جماعت دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح ایشوز کی سیاست کرے۔ ہم بطور تفہیم عرض کرتے ہیں کہ یہ اس طرح کی جماعت ہو جس طرح کی مثلاً ترکی میں اردوان کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی ہے۔ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ حالیہ انتخابات میں ترکی کی (جماعت اسلامی) یعنی نجم الدین اربکان کی (رفاہ پارٹی) اردوان کے خلاف سیکولر جماعتوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی سیاسی جماعتیں کتنی تنگ نظر ہوتی ہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان کے قائدین بھی اسی تنگ نظری کا شکار ہیں اور سمجھتے ہیں کہ صرف وہی اسلامی انقلاب لاسکتے ہیں یا ان کے ٹھپّے والے لوگ 'اسلامک فرنٹ'، 'پاسبان' وغیرہ انقلاب لاسکتے ہیں۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ لوگ 'دینی سیاسی جماعتوں' سے بیزار اور تنگ ہیں۔ وہ ڈیلیور نہیں کرسکیں اور پاکستانی معاشرے میں اب ان کا جو امیج بن گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ڈیلیور کر بھی نہیں سکتیں اور نہ لوگ کبھی انہیں ووٹ دیں گے۔ پاکستان کے عوام مذہبی معاملات میں علماء کا احترام ضرور کرتے ہیں لیکن انہیں ووٹ نہیں دیتے کیونکہ علماء اور ان کی جماعتوں نے ریاست چلانے اور عوام کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں اپنی نااہلیت ثابت کردی ہے۔ اسی لیے ہم کہہ رہے ہیں کہ اب ایک ایسی سیاسی جماعت بننی چاہیے جس پر 'دینی سیاسی جماعت' ہونے کا ٹھپّہ نہ ہو بلکہ وہ دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح کی ایک عام سیاسی جماعت ہو لیکن اس کے اہداف دینی ہوں اور قیادت اس کے لیے مخلص ہو۔ اس کے لیے معاشرے میں بہت سے افراد موجود ہیں اور جماعت کے پاس بھی ایسے آدمیوں کی کمی نہیں (جمعیت سے وابستہ سابقہ لوگ، پروفیشنلز

وغیرہ) صرف سوچ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

اگر جماعت اپنی بنیادی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنے کو تیار ہوتو اس کی دعوت، تعلیم، تربیت وتزکیہ اور تنظیمی امور میں آئندہ پالیسی کیا ہونی چاہیے؟ ہماری رائے میں اس کے خدوخال یہ ہیں:

دعوت

۱۔ مرکزِ جماعت میں دعوت کے لیے ایک تربیت گاہ یا دعوہ اکیڈمی بنائی جائے۔ جب اس کا ماڈل سیٹ ہو جائے تو چاروں صوبوں میں بلکہ اس سے بھی زیادہ تربیت گاہیں قائم کی جائیں۔ ان میں داعیوں کی تربیت کی جائے اور انہیں دعوت کے طریقے اور گُر سکھائے جائیں۔

۲۔ ایک دعوتی ٹی وی چینل قائم کیا جائے جو مختلف سطحوں کے دعوتی و تعلیمی پروگرام چلاتا رہے۔ یہ نیوز چینل نہ ہو اور نہ جماعت کی عملی سیاست اس کا ہدف ہو۔

۳۔ اسی طرح مناسب افراد پر مشتمل ایک ٹیم تیار کی جائے جو سوشل میڈیا پر اسلامی اصول واقدار کو زیر بحث لائے اور لوگوں کے سوالات وشبہات کے جوابات دے تاکہ اسلام کا عصرِ حاضر میں قابل عمل ہونا اور دوسرے نظام ہائے حیات سے بہتر ہونا مسلمانوں پر اور دنیا پر واضح ہو جائے۔

۴۔ دعوت کی ضرورت واہمیت پر مزید لٹریچر کی تیاری۔

تعلیم

۱۔ جماعت کے پاس ایسے دینی مدارس ہونے چاہئیں جن میں ایسے علماء دین تیار ہوں جو دینی علوم میں رسوخ رکھنے کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی بخوبی واقف ہوں اور عصری معاملات میں عوام کی دینی رہنمائی کر سکتے ہوں۔

اس کی تفصیلات طے کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی جائے اس میں دینی مدارس کے ایک دو علماء کے ساتھ ایسے اسلامی سکالرز اور ماہرین تعلیم بھی شامل ہوں جو دینی علوم میں مہارت رکھتے ہوں۔

۲۔ جماعت کے لوگوں کے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ایسی ہونی چاہئیں جن میں جدید علوم کی تدریس اسلامی تناظر میں اور اسلامی علوم کی معیت میں کی جائے اور طلبہ وطالبات

کی دینی تربیت بھی ہو۔ یہ تعلیمی ادارے دین کی دعوت و تربیت کے مراکز ہونے چاہئیں۔

جماعت کے لوگوں کے اکثر موجودہ تعلیمی ادارے صرف مالی منفعت کے لیے (بطور تجارت) قائم کیے گئے ہیں اور وہ مغربی فکرو تہذیب کے غلبے اور فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اس چیز کا تدارک ضروری ہے۔

اس کام کی تفصیلات طے کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی جائے اس میں جدید تعلیمی ادارے چلانے والے ایک دو آدمیوں کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر کے حامل وہ ماہرین تعلیم بھی شامل ہوں جو اپنے کمرشل تعلیمی ادارے نہیں چلاتے۔

نوٹ: دینی تعلیم کی بہتری اور جدید تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے 'تحریک اصلاح تعلیم' نے برسوں ہوم ورک کرکے وسیع لٹریچر تیار کیا ہے۔ لٰہذا کمیشن یا مجوزہ کمیٹی کے مطالبے پر اس حوالے سے مختصر یا تفصیلی رپورٹیں فی الفور مہیا کی جاسکتی ہیں۔

تربیت و تزکیہ

۱۔ تربیت و تزکیۂ نفس کی ضرورت، اہمیت اور غایت کے لیے مزید لٹریچر تیار کیا جائے۔

۲۔ پہلے مرکز میں ایک تربیت گاہ بنائی جائے جس میں ارکان جماعت آکر ہفتہ عشرہ قیام کریں۔ اس سے پیش نظر یہ ہو کہ وابستگان جماعت میں للّٰہیت اور تقرب الی اللہ پیدا ہو۔ انہیں تلاوت قرآن، نماز میں خضوع و خشوع، کثرتِ ذکر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دن رات کے اعمال واذکار اور دعاؤں پر عمل کی عادت پڑے۔ مادہ پرستی اور حب جاہ و مال سے نفور پیدا ہو اور تقویٰ اور آخرت کی فکر بڑھے۔ ایک ماڈل تربیت گاہ کے کامیاب تجربے کے بعد چاروں صوبوں میں بلکہ مزید جگہوں پر ایسی تربیت گاہیں قائم کی جائیں جو سارا سال کام کرتی رہیں۔

۳۔ اس تربیت گاہ میں والدین کے لیے خصوصی تربیتی پروگرام ہوں تاکہ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی اسلامی تربیت کرنا سیکھیں۔ مرد و خواتین اساتذہ کے لیے خصوصی تربیتی پروگرام ہوں تاکہ وہ اپنی اور اپنے طلبہ و طالبات کی اسلامی تربیت کرنا سیکھیں۔ قائدین کی خصوصی تربیت ہو تاکہ ان میں للّٰہیت پیدا ہو اور وہ سیکھیں کہ وہ اپنی اور اپنے جونیئرز کی اسلامی تربیت کیسے کریں!

۴۔ دعوت وتربیت کی ترتیب قرآن وسنت کی رو سے اور صحابہ واسلاف کے عمل کے مطابق الاقرب فالاقرب کی ہے یعنی پہلے اپنی ذات کی اصلاح اور اچھا باعمل مسلمان بننا۔ پھر اپنے اہل وعیال اور خاندان (عزیز واقارب، برادری) کی اصلاح۔ پھر گلی محلے، شہر اور ملک یعنی معاشرے کی اصلاح اور پھر حکومت وریاست کی اصلاح۔

نوٹ: اگر جماعت مولانا مودودیؒ کی نظر ثانی شدہ حکمت عملی کی طرف مراجعت نہ کرے تو دعوت، تعلیم اور تربیت وتزکیہ کے لیے ہماری مندرجہ بالا تجاویز کا زیادہ فائدہ نہ ہوگا اور وہ سیاسی جدوجہد کا ضمیمہ بن کر اور اس کے نیچے دب کر غیر مؤثر ہو جائیں گی۔

تنظیمی امور

۱۔ جماعت میں دعوت، تعلیم، تربیت وتزکیہ اور سیاسی حکمت عملی کے چار بڑے شعبے یا سیکرٹریٹ قائم کیے جائیں جن میں سے ہر ایک کا کُل وقتی ناظم ہو۔

۲۔ جماعت کا ایک تھنک ٹینک ہو جس میں جماعت کے ہمدرد دانش ور بھی ہوں اور خصوصی دعوت پر ناقدین اور مخالفین کو بھی مدعو کیا جائے۔

۳۔ دستور میں مرکزیت اور جکڑ بندی ختم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تبدیلیاں کی جائیں:

i۔ ہر مسلمان جسے جماعت کے مقاصد سے اتفاق ہو، جماعت کا رکن بن سکے۔ جو لوگ جماعت میں اس طرح آئیں جماعت ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرے۔

ii۔ نجوی کے تصور کا خاتمہ۔ ارکانِ جماعت ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال میں اور قیادت پر تنقید میں آزاد ہوں۔

۴۔ دستور میں سے وہ جملہ نکال دیا جائے جس میں کہا گیا ہے کہ 'اللہ و رسول کے سوا کوئی معیارِ حق نہیں اور نہ کوئی تنقید سے بالاتر ہے۔'

نوٹ: یہ تجاویز ہمارا آئیڈیل نہیں ہیں بلکہ جماعت کے فکری پیراڈائم کے اندر رہتے ہوئے اور ہمارے فکری تناظر کے قریب رہتے ہوئے، یہ ممکنہ طور پر بہترین تجاویز ہیں۔

هذا من عندنا والعلم عند الله.

ضمیمہ ①

اس امر کے شواہد و ثبوت کہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۷۵ء میں انتخابی سیاسی جدوجہد سے مراجعت کر لی تھی

[یہ مضمون ہم نے ماہنامہ البرہان کے نومبر ۲۰۱۷ء کے شمارے میں ''انتخابی جدوجہد اور غلبۂ دین- سید مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی فکر- ایک تجزیہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب (کراچی) سے مکالمے کی صورت میں شائع کیا تھا۔مدیر]

۱۔ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب بزرگ، نیک، مخلص اور محنتی دانشور ہیں۔ وہ اس لحاظ سے ہمارے فکری حلیف ہیں کہ کراچی میں ان کا حلقۂ فکر مغربی فکر و تہذیب کے خلاف ایک بڑا مورچہ ہے اور ہم لاہور میں یہی دیا جلائے رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے اور ان کے فکری اشتراک کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہم اور وہ دینی قوتوں کے اتحاد اور معاشرتی تنظیم کے ذریعے مسجد کو مرکز بنا کر جہالت، بدامنی، بے انصافی اور غربت کے خلاف جدوجہد کے قائل اور داعی ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان ایک اور قدر مشترک یہ ہے کہ وہ مولانا مودودیؒ کے محب اور جماعت اسلامی کے حامی اور مویّد ہیں اور جماعت کو سیاسی میدان میں کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں اور ہم بھی جدید دینی تحریکوں کے مؤید، سید مودودیؒ کی عظمت فکر و عمل کے قائل اور جماعت اسلامی کے بہی خواہ ہیں۔ اختلاف رائے اس امر میں ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی اپنی موجودہ سیاسی انتخابی جدوجہد کے ذریعے پاکستان میں غلبۂ دین کا مقصد حاصل کر سکتی ہے اور یہی مولانا مودودیؒ کی حکمت عملی تھی۔ جبکہ ہماری رائے اس کے برعکس ہے۔

ہم اپنا موقف البرہان میں کئی دفعہ زیر بحث لا چکے ہیں لیکن لگتا ہے کہ محترم ڈاکٹر انصاری صاحب کی نظر سے ہماری تحریریں نہیں گزریں۔ بہرحال تازہ بحث کی تکمیل کی خاطر ہم اپنا موقف ایک بار پھر پیش کیے دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ محترم ڈاکٹر صاحب اور جماعت اسلامی کے احباب اس اختلافی بحث کا خوش دلی سے مطالعہ کریں گے۔

چونکہ ڈاکٹر انصاری صاحب کہتے ہیں کہ انتخابی سیاست کے حق میں جو موقف وہ پیش

کررہے ہیں وہ مولانا مودودیؒ کی فکر پر مبنی ہے اور یہی جماعت اسلامی کے موقف کے عین مطابق ہے، لہٰذا مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس بحث کو دو حصوں میں تقسیم کردیں۔ اسلام، مغربی جمہوریت اور پاکستان میں غلبۂ دین بذریعہ جمہوری انتخابات کے حوالے سے پہلا حصہ مولانا کی فکر کے بارے میں اور دوسرا حصہ مولانا کے بعد پاکستان میں غلبۂ دین کے لیے جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد کے حوالے سے۔

مبحث اوّل: اسلام، مغربی جمہوریت اور پاکستان میں غلبۂ دین بذریعہ انتخابی جدوجہد کے حوالے سے مولانا مودودیؒ کی فکر

پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلمانوں کے مخصوص حالات تھے کہ خلافت ختم ہوچکی تھی، مسلمان مغلوب ہوچکے تھے، ان کی اجتماعی قوت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور کوئی بڑی مسلم ریاست باقی نہ رہی تھی جبکہ مغربی فکر وتہذیب اور اس کے علمبردار ممالک ہر سو غالب تھے۔ ان حالات میں سید مودودیؒ نے 'اقامت دین' کا نظریہ پیش کیا کہ انفرادی مسلمانی کافی نہیں بلکہ دین کا تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی زندگی پر بھی دین کا غلبہ ہو، اسلامی ریاست وجود میں آئے اور اقتدار کفار وفساق وفجار کے ہاتھوں سے نکل کر صالحین کے ہاتھوں میں آجائے۔ مولانا نے اس ہدف کو دین کا حاصل اور نصب العین قرار دیا اور اس کے لیے آیات واحادیث کی مخصوص تشریح کرکے اسے علمی استناد مہیا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان اس وقت اکثر وبیشتر مغربی استعمار کے خلاف مزاحمت کررہے تھے اور آزادی کے لیے حسب موقع وضرورت پُرامن جدوجہد کررہے تھے یا مسلح مزاحمت میں مصروف تھے۔

دریں صورت کئی اہل علم نے مولانا کے اسلوب دعوت کی تعریف کی جو مغرب زدہ نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق تھا اور انہیں مغربی تہذیب کی مرعوبیت سے نکال کر اسلام کی طرف پلٹنے میں معاون ہورہا تھا۔ تاہم روایتی علماء اور دینی جماعتیں اگرچہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام پر عمل اور اسلامی ریاست کے قیام پر متفق تھیں لیکن ان کی اکثریت نے مولانا کے اقامت دین کے مخصوص تصور اور اس کے لیے وضع کردہ علم کلام کی مخالفت کی کیونکہ ان کی رائے میں یہ دین کی سیاسی تعبیر تھی اور سیاست کو دین

اور دین کو سیاست کے مساوی سمجھنے کا عمل تھا جس سے دین کے دوسرے اہم اجزاء سے صَرف نظر ہوتا تھا۔ چنانچہ ان میں سے بہت سوں نے اسے دین میں مبالغہ اور تحریف سمجھا۔

اس دوران مولانا نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم کر لی تا کہ اقامت دین کے لیے اجتماعی جدوجہد کی جا سکے۔ مولانا نے اس کے لیے جو حکمت عملی وضع کی وہ یہ تھی کہ دعوت دین اور اصلاح فرد و معاشرہ کے لیے کام کیا جائے اور اس کام کو اتنا بڑھایا اور پھیلایا جائے کہ سوسائٹی میں ایک تغیر پیدا ہو اور اس کے منطقی انجام کے طور پر لوگوں کی حمایت سے اسلامی ریاست وجود میں آئے جس کی باگ ڈور صالحین کے ہاتھ میں ہو۔ [1]

اس دوران مغربی فکر و تہذیب کے حوالے سے مولانا کا موقف یہ تھا کہ یہ جاہلیت خالصہ ہے۔ [2] اور آپ نے اس کے خلاف تند و تیز مضامین لکھے جو آپ کی کتاب 'تنقیہات' میں شائع ہوئے۔ مغرب کی سیاسی فکر کے ایک اہم ستون نیشنلزم یا وطن پرستی کے خلاف آپ نے مہم چلائی اور ان علماء کی مخالفت کی جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ ہندوستان کے حق میں سیاسی جدوجہد کر رہے تھے۔ آپ نے کہا کہ وطن کی بنیاد اس کا اسلامی اور نظریاتی بنیاد پر استوار ہونا ہے نہ کہ مغربی اصولوں کے مطابق اشتراک رنگ و نسل اور علاقے و زبان کے مشترک ہونے پر۔ جماعت بنانے کے بعد مولانا نے انگریز کی ملازمت اور اس کی عدالتوں سے رجوع کو غیر اسلامی قرار دے دیا۔

مندرجہ بالا نقطۂ نظر مولانا کا قیام پاکستان سے پہلے تک تھا اور جماعت اس کے مطابق مصروف جدوجہد تھی کہ مسلم لیگ کی جدوجہد سے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا، ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور مولانا اور جماعت کو مشرقی پنجاب کے قصبہ پٹھان کوٹھ سے لاہور ہجرت کرنا پڑی۔

مولانا مودودیؒ کے دو اجتہادی فیصلے

قیام پاکستان کی وجہ سے صورت حال میں یہ بنیادی تبدیلی آئی کہ اب مسلمان نہ برطانیہ

---

[1] دیکھیے ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودیؒ کی علی گڑھ میں تقریر جو 'اسلامی ریاست کس طرح قائم ہوتی ہے؟' کے عنوان سے پمفلٹ کی صورت میں جماعت شائع کرتی ہے۔

[2] دیکھیے پمفلٹ 'اسلام اور جاہلیت'

کے غلام رہے تھے اور نہ انہیں بڑی ہندو اکثریت کا سامنا تھا بلکہ پاکستان ایک مسلم مملکت تھی جس میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مسلم لیگی قیادت نے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا وعدہ کیا تھا اور عوام میں اس حوالے سے جوش وخروش تھا لہٰذا مولانا مودودیؒ نے سوچا کہ دعوت دین اور اصلاح فرد و معاشرہ کے ذریعے قیام اسلامی ریاست کی بجائے اب براہ راست سیاسی جدوجہد کے ذریعے پاکستان کو مکمل اسلامی ریاست بنانے کی کوشش کی جائے۔ تاہم انہوں نے اس موقع پر یہ بھی لکھا کہ اگر ہمارا یہ تجربہ کامیاب نہ ہوا تو ہم اپنے پہلے موقف (قیام اسلامی ریاست واقامت دین بذریعہ دعوت دین اور اصلاح فرد و معاشرہ) کی طرف لوٹ جائیں گے۔ (ہم مولانا کی متعلقہ تحریر بطور ضمیمہ شائع کر رہے ہیں۔)

کئی اہل علم کے نزدیک مولانا کا یہ فیصلہ نقلاً درست تھا نہ عقلاً کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کی براہ راست نگرانی میں دین کو غالب کرنے کے لیے جو جدوجہد کی اس کی بنیاد دعوت واصلاح پر تھی [illegible] [البقرہ ۲: ۱۲۹] یعنی پہلے آدمی کو بدلا جائے، انسانوں کی تعلیم وتربیت پر محنت کی جائے۔ انہیں تجربات اور سختیوں سے گزرنے کا موقع ملے تاکہ ان کا مخلص اور مستحق نصرتِ الٰہی ہونا ثابت ہوجائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیرہ سال تک مکہ میں انسان سازی کا یہ کام کیا اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے ایسے افراد کی ایک قابل بھروسہ جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے جو بعد میں ہر آزمائش میں پورا اُتری اور اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ بنی۔ لہٰذا غلبۂ دین کا الٰہی اور نبوی منہج یہ ہے کہ پہلے دعوت واصلاح اور تعلیم وتزکیہ کے ذریعے افراد کو بدلا جائے اور پھر ان افراد کے ذریعے معاشرے اور ریاست کو بدلا جائے۔

عقلاً یہ بات اس لیے غلط تھی کہ آپ جس جمہوریت اور نظام انتخاب کو قبول کرنے چلے تھے اس میں کامیابی کا انحصار اس بات پر تھا کہ آپ کو عوام کی حمایت حاصل ہو، وہ آپ کے ہم خیال ہوں، وہ اپنے آپ پر اسلام نافذ کرنے کے مشتاق ہوں اور معاشرے اور ریاست کو اسلامی اصولوں پر چلانے کے لیے پرعزم ہوں اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے پر تیار ہوں۔ ظاہر ہے یہ کام بڑے پیمانے پر دعوت واصلاح اور تعلیم وتربیت کی محنت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اگر آپ یہ بنیادی کام کیے بغیر عوام کے پاس ووٹ لینے پہنچ جائیں گے تو وہ آپ کو ووٹ کیوں

دیں گے؟

دوسرا اجتہاد

دوسرا بڑا مسئلہ جس میں مولانا کو اجتہاد کرنا پڑا وہ مغربی جمہوریت کے بارے میں تھا۔ سارے اہل علم جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ:

۱۔ مغربی فکر و تہذیب جاہلیت خالصہ ہے۔ اس کی بنیاد ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریل ازم، کیپٹل ازم، ایمپریسزم .... پر ہے اور یہ نظریات مل کر جو ورلڈ ویو (تصورِ انسان، تصورِ الٰہ، تصورِ کائنات اور تصورِ علم) بناتے ہیں وہ سو فی صد غیر اسلامی ہے کیونکہ اس کی رو سے انسان مختار مطلق ہے اور وہ کسی کا عبد نہیں۔ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہیں۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ ہے تو وہ اپنی ذاتی زندگی میں اس کی پوجا پاٹ کر لے لیکن انسانوں کی عملی اور اجتماعی زندگی میں اللہ و رسول اور مذہب کو مداخلت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور یہی ہماری ساری جدوجہد کا ہدف ہونی چاہیے۔ وحی کوئی چیز نہیں اور حقیقی علم وہ ہے جو انسان مشاہدے اور تجربے سے حاصل کرتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام کا ورلڈ ویو یہ ہے کہ اللہ خالق و مالک و رازق و پروردگار اور واحد معبود ہے۔ انسان اس کا عبد ہے جس کا بنیادی فریضہ اللہ کی عبادت و اطاعت اور اس کی رضا حاصل کرنا ہے۔ یہ دنیا عارضی اور دارالامتحان ہے اور اس کے بعد ایک دوسری دنیا آنے والی ہے۔ انسانی زندگی کا لائحہ عمل وہ ہدایت طے کرتی ہے جو وحی پر مبنی ہوتی ہے ....

اس مختصر تقابل سے ظاہر ہے کہ مغربی فکر و تہذیب ایک الگ پیرا ڈائم (دائرہ فکر و عمل، طرز زندگی، اسلوبِ حیات) ہے اور اسلام اس سے مختلف و متضاد دوسرا پیرا ڈائم ہے اور یہ دونوں چونکہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں لہٰذا یہ دونوں ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے اور ان کے درمیان تلفیق (Merger) ممکن نہیں۔

مثلاً مغرب کے سیاسی نظام کو لیجیے۔ یہاں حاکمیت اعلیٰ انسان کو حاصل ہے جو مختار مطلق ہے اس کا اظہار پارلیمنٹ کی بالادستی میں ہوتا ہے کیونکہ وہ مختار مطلق انسان کے نمائندوں کی جگہ ہے لہٰذا وہ جو قانون چاہیں بنا سکتے ہیں، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور

انہوں نے کیا بھی ہے اور زنا، شراب نوشی، جوئے، ہم جنس شادیوں اور نکاح کے بغیر عورت مرد کے اکٹھے رہنے کو قانونی قرار دیا ہے۔ مغرب کے سیاسی نظام میں آئین مقدس ترین دستاویز ہوتی ہے اور ریاست کے سارے ادارے اس کے اتباع کے پابند ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان انسانوں اور ان کے نمائندوں نے بنایا ہوتا ہے جو مختار مطلق اور حاکم اعلیٰ ہوتے ہیں۔ کسی علمی اور اخلاقی معیار سے قطع نظر یہاں ہر انسان کا ووٹ برابر ہوتا ہے (خواہ وہ جاہل و بدمعاش ہو یا نیک اور عالم)۔ یہاں نمائندگی حاصل کرنے کے لیے آپ دولت کے دریا بہا سکتے ہیں اور امیدوار بن کر اپنے منہ میاں مٹھو بن سکتے اور خود کو فرشتہ صفت ثابت کر سکتے ہیں۔ رنگ، نسل، علاقے، مسلک، خاندان اور برادری کے تعصب کی بنیاد پر ووٹ مانگ سکتے ہیں۔ مغرب کا یہ سیاسی نظام 'جمہوریت' کہلاتا ہے جس میں مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق انتخابات ہوتے ہیں اور جیتنے والے عوام کے نمائندے ان اصولوں کے مطابق حکومت اور ملک کا نظام چلاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں جو اسلام کا سیاسی نظام ہے، ہم اس کی تفصیلات میں نہیں جاتے کیونکہ ایک عامی مسلمان بھی سمجھ سکتا ہے کہ مغربی جمہوریت کے یہ سارے اصول غیر اسلامی ہیں اور مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہیں۔

۲۔ اصطلاحات ہمیشہ کسی تہذیب کے بنیادی نظریات، ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کی پیداوار ہوتی ہیں اور اگر دو تہذیبیں اور ان کے ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم ایک دوسرے سے متضاد ہوں تو ان کی مصطلحات بھی اپنے متضمنات اور مفاہیم میں ایک دوسرے کی ضد ہوں گی اور ان دونوں کو ملایا نہ جا سکے گا مثلاً اسلام میں 'صلاۃ' کا جو مفہوم ہے وہ 'Prayer' میں موجود نہیں اور نہ اس میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں 'دِیت' کا جو مفہوم ہے، Blood Money کے الفاظ اس کے سارے مفاہیم کا احاطہ نہیں کرتے۔ اسی طرح اسلام میں 'شورائیت' کا جو مفہوم ہے اسے 'مغربی جمہوریت' پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی کرے تو یہ قیاس مع الفارق ہوگا اور غلط ہوگا۔

اس کے باوجود مولانا مودودیؒ نے مغرب کی لادین جمہوریت کو جو ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریل ازم اور کیپٹل ازم جیسے کفریہ نظریات کی پیداوار تھی جنہیں وہ ماضی میں جاہلیت خالصہ قرار دے چکے تھے، اس میں چند اسلامی اصول داخل کر کے اس کو مشرف بہ اسلام کر لیا اور اسے 'اسلامی جمہوریت' کہہ کر قبول کر لیا اور نہ صرف یہ بلکہ اس کے تحت انتخابات

کو پاکستان میں اقامت دین اور غلبۂ دین کا ذریعہ بھی قرار دے دیا۔

مولانا کے اجتہادات پر ردّعمل

مولانا کے ان دو اجتہادات پر ردعمل کیا ہوا؟ پہلے اجتہاد کو خود جماعت کے اکابر علماء اور دانشوروں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ماچھی گوٹھ کے اجتماع کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، حکیم عبدالرحیم اشرف، ڈاکٹر اسرار احمد اور دوسرے زعماء جماعت کو چھوڑ گئے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا کہ مولانا کے تجویز کردہ راستے پر چلنے کے نتیجے میں جماعت محض ایک سیاسی جماعت بنتی جاری ہے اور دعوت دین اور اصلاح فرد و معاشرے کا کام پس پشت چلا گیا ہے۔ البتہ مولانا کے دوسرے اجتہاد کو علماء نے قبول کر لیا اور روایتی دینی جماعتوں نے بھی اسلامی جمہوریت کو قبول کر کے جمہوری انتخابات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

اس نقطۂ نظر کو مغرب نے بھی خوش آمدید کہا اور اس کی حمایت کی کیونکہ اس طرح دینی عناصر گویا مغرب کی پچ پر کھیلنے کے لیے تیار ہو گئے اور یہ نظام چونکہ ان کا تھا لہٰذا انہیں پتہ تھا کہ کس طرح وہ مختلف حربے استعمال کر کے دینی عناصر کو بآسانی شکست دے سکتے تھے۔ چنانچہ مقامی حکمرانوں کو ساتھ ملا کر اور دینی عناصر کو آپس میں لڑا کر وہ انہیں ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئے اور خصوصاً دوسری دینی سیاسی جماعتوں کو جماعت اسلامی کے خلاف کھڑا کر کے جماعت کو سیاسی میدان میں شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔

اجتہاد کی عظمت اور صحت کا مسئلہ

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی عالم کے اس کے کسی اجتہاد کے صحیح نہ ہونے پر اس پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ سید مودودیؒ بلاشبہ ایک متبحر عالم تھے، دانش ور، مفکر اور متکلم تھے۔ ان کی دینی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کی جلالت علمی کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کے کسی اجتہاد کے صحیح نہ نکلنے پر ان کی عظمت میں کوئی کمی آتی ہے۔ اجتہاد ایک عظیم منہج ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جو عالم یا حاکم اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد صحیح نکلے تو اس کے لیے دوہرا

اجر ہے اور اگر اس کا اجتہاد صحیح نہ نکلے تو اس کے لیے اکہرا اجر ہے۔ [۱]

دوسری بات یہ ہے کہ کیسے پتہ چلے کہ کسی عالم کا اجتہاد صحیح ہے یا نہیں؟ اس کے دو حل ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ اگر کسی مسئلے کے دو حل سامنے آ رہے ہوں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ کس کا موقف اوفق بالقرآن والسنۃ ہے اور کس کی شرعی دلیلیں قوی تر ہیں اور صحابہ وسلف اور جمہور علماء کے نزدیک زیادہ معتبر ہیں؟ اور دوسرا معیار یہ ہے کہ جس مسئلے کو حل کرنے کے لیے وہ اجتہاد کیا گیا تھا اس سے وہ مسئلہ حل ہوا یا نہیں اور اس سے مطلوبہ نتائج نکلے یا نہیں؟

مولانا کے پہلے اجتہاد کا نتیجہ

اس لحاظ سے اگر ہم مولانا مودودیؒ کے مذکورہ بالا دونوں اجتہادوں کو دیکھیں تو پہلے اجتہاد کے مطلوبہ نتائج نہیں نکلے۔ اور مولانا مودودیؒ چونکہ ایک ذہین آدمی تھے اور اپنی کاز کے لیے مخلص بھی تھے لہٰذا وہ اپنی کوششوں اور ان کے حاصلات کا جائزہ لیتے رہے۔ ہمیں سید اسعد گیلانی مرحوم (سابق رکن شوریٰ وعاملہ، امیر جماعت اسلامی پنجاب/ لاہور و رکن قومی اسمبلی) نے خود بتایا کہ ایک دفعہ میں مولانا مودودیؒ کے ساتھ جماعت کے معاملات پر گفتگو کر رہا تھا تو میں نے کہا کہ ''مولانا! کیا جماعت اسلامی آج اُسی طرح کی سیاسی جماعت نہیں بن گئی جس طرح کی مسلم لیگ ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی؟'' تو مولانا نے نظریں جھکا لیں اور خاموش ہو گئے۔

بالآخر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جماعت کی بری طرح ناکامی کے بعد مولانا نے اپنے موقف پر نظر ثانی کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنی ایک تقریر میں کہا کہ انتخابات تبدیلی کا واحد ذریعہ نہیں۔ یہ تقریر الطاف حسن قریشی اور مجیب الرحمن شامی کے ہفت روزہ 'طاہر' میں چھپی جس کا عکس ہم ضمیمہ میں دے رہے ہیں۔ پھر مولانا نے جماعت کی شوری میں تفصیل سے اپنا موقف رکھا۔ اس کی کچھ تفصیلات حیدر آباد کے مولانا وصی مظہر ندویؒ نے (جو اس وقت شوری کے رکن تھے) اپنے اس انٹرویو میں دی ہیں جو انہوں نے مئی ۱۹۸۳ء میں روزنامہ نوائے وقت کو دیا تھا۔ اس میں مولانا ندوی نے کہا:

---

[۱] صحيح بخاری، بَابُ أَجْرِ الحَاكِمِ إِذَا اجْتَهَدَ فَأَصَابَ أَوْ أَخْطَأَ، حديث نمبر: ۷۳۵۲

’’مولانا مودودیؒ بھی بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچ چکے تھے (کہ انتخابات کے ذریعہ سے اسلامی نظام کا قیام عمل میں نہیں آسکتا) دسمبر ۱۹۷۵ء کی جماعت کی شوریٰ میں شدید علالت کے باوجود بیس منٹ کی جو مختصر تقریر انہوں نے کی تھی، اس میں انہوں نے صاف صاف کہا تھا کہ میں نے بالغ رائے دہی کی وکالت کی ہے لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ میری غلطی تھی اور یہ امت کی قسمت کو جاہلوں کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے یہ بات بھی کہی تھی کہ اس ملک میں آج تک جو شخص نمبر دو پر کھڑا تھا اسی نے جگہ سنبھال لی۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں اس بات کی زیادہ وضاحت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ نمبر دو پر کھڑے ہونے سے میری مراد کیا ہے؟ مولانا مودودیؒ کی یہ تقریر شوریٰ کی کاروائی میں مکمل طور پر درج ہے.....‘‘

اگلے سوال کے جواب میں مولانا وصی مظہر ندوی نے جواب دیا۔

’’میرے پاس شواہد موجود ہیں کہ مولانا مرحوم اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جماعت کی قیادت سے قطعاً مایوس ہو چکے تھے۔ ایک بار تو نوبت یہاں تک آئی کہ مولانا مودودیؒ کو ان قائدین کے خلاف اخبارات میں بیان جاری کرنا پڑا جس میں انہوں نے میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور احمد کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ جماعت اسلامی کو چلانے کے لیے لیڈر بنائے گئے ہیں جماعت کو ختم کرنے کے لیے نہیں۔ جماعت کے رہنماؤں نے اس بیان کو Kill کرانے کی بے حد کوشش کی لیکن وہ بعض اخبارات میں شائع ہو ہی گیا۔‘‘

اس حوالے سے ان کی مولانا مودودیؒ سے خط و کتابت بھی ہوئی جس میں سے مولانا کے ان کے نام دو خطوط کی عکسی نقل ہم ضمیمہ میں دے رہے ہیں۔

لیکن.... جن لوگوں کو خود مولانا نے انتخابی سیاست کی راہ پر ڈالا تھا، وہ مولانا کی بات کی گہرائی کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے مولانا کی رائے کو قبول نہ کیا۔ مولانا کو اس سے گہرا صدمہ پہنچا لیکن چونکہ وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور بیمار اور کمزور تھے لہٰذا نئی بنیادوں پر کوئی تحریک از سر نو کھڑی کرنے کے قابل نہ تھے۔ اور چونکہ جماعت ان کی زندگی بھر کی محنت کا ثمر تھی لہٰذا وہ اسے انتشار میں مبتلا کر کے کمزور بھی نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

جماعت کے ایک معروف اور ذمہ دار رکن نے (جو الحمدللہ بقید حیات ہیں) ہمیں بتایا کہ ایک دفعہ انہوں نے قاضی حسین احمدؒ سے پوچھا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ نے شوریٰ میں اپنے خطاب میں کہا تھا کہ جماعت کو انتخابی سیاست کی بجائے اصلاح فرد ومعاشرہ کی طرف پلٹ جانا چاہیے، کیا یہ تاثر درست ہے؟ قاضی صاحب مرحوم نے جواب دیا کہ ہاں۔ اب بھی ارکان جماعت میں سے کوئی اس موضوع پر تحقیق کرنا چاہے تو وہ مرکز جماعت کے شعبۂ تنظیم سے شوریٰ کی متعلقہ روداد نکلوا کر دیکھ سکتا ہے یا اُس زمانے کے ارکان شوریٰ کے نام دریافت کر کے، ان میں سے جو اصحاب زندہ ہوں، ان سے دریافت کر سکتا ہے۔

مبحث دوم: جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد

مولانا کے بعد جماعت کی قیادت نے انتخابی سیاست کے پروگرام کو جاری رکھا۔ وہ ہر الیکشن میں ناکام ہوئے اور اب ان کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ وہ چند سو ووٹ لیتے ہیں اور ان کی ضمانت ضبط ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ انتخابی سیاست چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کارکن مایوس ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور یہ بھی کہ اب جماعت اسلامی محض ایک سیاسی جماعت بن کر رہ گئی ہے اور دعوت واصلاح اور اصلاح فرد ومعاشرہ کی باتیں منصوبوں اور کاغذوں میں ضرور لکھی ہوتی ہیں لیکن عملاً کوئی بڑا کام نہیں ہو رہا۔

ہم جماعت کے احباب سے کہتے ہیں کہ انہیں انتخابی سیاست کے حوالے سے مولانا مودودیؒ کی نظر ثانی شدہ رائے مان لینی چاہیے۔ اگر قیادت نہیں چاہتی کہ اس فیصلے کا سارا بوجھ وہ خود اٹھائے تو وہ ارکان کو باہم مشاورت کی اجازت دے کر اور ریفرنڈم کرا کر ان کے فیصلے پر عمل کر سکتی ہے۔

اور اگر مستقل نہیں تو جماعت کم از کم آئندہ دس پندرہ سال کے لیے انتخابی سیاست روک کر، یا سیاسی جدوجہد کم کر کے، دعوت دین اور جماعت کی دعوت جم کر اور محنت سے لوگوں تک پہنچائے تا کہ لوگ جماعت کے پروگرام کو سمجھیں اور اس کی حمایت کریں۔

بعض لوگ غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جماعت نے انتخابی سیاست چھوڑ دی تو گویا اس

نے اقامت دین، انقلاب امامت اور قیادت کے صالح ہاتھوں کو منتقلی کا راستہ چھوڑ دیا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ میدان میں اترنے سے پہلے تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم جو تجویز دے رہے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ انتخابی سیاست میں اترنے سے پہلے آپ تیاری کریں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مصر، انڈونیشیا، فلسطین وغیرہ کی طرح جماعت خود دعوت واصلاح اور اصلاح فرد ومعاشرہ کے کام پر محنت کرے اور اپنی ایک سیاسی جماعت بنالے۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ انقلاب امامت کا ایک ہی طریقہ انتخابی سیاست نہیں ہے اور نہ یہ قرآن وحدیث میں کہیں لکھا ہے کہ انتخابی سیاست کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ جب آپ سوچنے بیٹھیں گے تو کئی دوسرے طریقے آپ کو سوجھیں گے جو زیادہ قابل عمل ہوسکتے ہیں۔ (ہم بھی کئی طریقے تجویز کرسکتے ہیں لیکن یہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے۔ ہم یہاں اگر اس کی تفصیل میں گئے تو خلط مبحث ہوگا)۔

مولانا کا دوسرا اجتہاد

مولانا کا دوسرا اجتہاد کہ انہوں نے جاہلیت خالصہ کی پیداوار اور مغرب کی سیاسی نظام کے اہم جزو جمہوریت میں کچھ اسلامی اصولوں کی پیوندکاری کرکے اسے 'اسلامی جمہوریت' بنالیا، یہ بھی غلط ثابت ہوا۔ ہم اس کے نقلی اور عقلی دلائل کچھ اوپر ذکر کرچکے اور کچھ مزید یہاں عرض کرتے ہیں۔

❁ خلافت کے خاتمے، غلامی اور دور زوال کے بعد جب مسلم ممالک آزادی حاصل کررہے تھے تو ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ سماجی علوم جن کا عملی زندگی سے گہرا تعلق ہے جیسے سیاسیات، معاشیات، تعلیم، قانون، نفسیات وغیرہ، ان میں نیا اجتہاد کیا جاتا کیونکہ صدیوں پہلے کے اجتہادات اب زیادہ کارآمد نہ رہے تھے اور پھر اب مسلمانوں کا مقابلہ ایک غالب اور بالادست الحادی فکر وتہذیب سے تھا.... لیکن سید مودودیؒ اور دوسرے اہل علم نے اس چیلنج کو قبول کرنے کی بجائے یہ آسان راستہ اختیار کیا کہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی پیداوار مغربی جمہوریت کو قبول کرکے اور اس میں چند اسلامی اصولوں کی پیوندکاری کرکے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا اور اس پر عمل شروع کردیا اور اپنی سادگی، خوش فہمی اور خوش امیدی میں یہ توقع بھی باندھ لی کہ اس سے پاکستان میں اسلام کا غلبہ ہوجائے گا حالانکہ یہ نقلاً

اور عقلاً اُس وقت بھی درست نہیں تھا بلکہ

[illegible] [آل عمران ۳: ۸۵] کے تحت مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کو رد کرنا ضروری تھا کیونکہ اس کا غیر اسلام اور ماسوا اسلام ہونا ظاہر و باہر تھا اور ہے۔

❁ اگر مغرب کا کوئی ادارہ غیر اقداری (Value-Neutral) ہوتا تو اس کو قبول کرنے کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا اور سوچا جا سکتا ہے کہ اسے قبول کر کے اور اپنے حالات اور نظریات کے مطابق اس میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے اپنا لیا جائے۔ لیکن مغربی جمہوریت تو براہ راست ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم کی پیداوار تھی اور اس کے غیر اسلام اور خلاف اسلام ہونے کے بارے میں کوئی دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی تھی الا یہ کہ کوئی تجدد سے اسے اسلامی کور (Cover) مہیا کر کے ایک غیر اسلامی چیز کو اسلامی باور کرنا اور کرانا شروع کر دے۔

❁ اور اس اجتہاد کے صحیح نہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس برائے نام 'اسلامی جمہوریت' کے نتیجے میں ملک میں اسلام کا غلبہ نہیں ہوا بلکہ مغربی فکر و تہذیب (سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریلزم، کیپٹل ازم....) کا غلبہ ہو گیا ہے اور پاکستانی فرد، معاشرہ اور ریاست دن بدن اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہو چکی ہیں اور بگاڑ و فساد کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے کہ دینی اصلاحی تحریکوں اور اداروں کا کام بھی غیر موثر ہو کر رہ گیا ہے۔

اگر کوئی ہمارے اس موقف پر یہ اعتراض کرے کہ جب مغربی جمہوریت یا برائے نام 'اسلامی جمہوریت' ہی ملک میں رائج ہو اور اس کے علاوہ عملی سیاسی جدوجہد کا کوئی اور راستہ کھلا ہی نہ ہو تو اس جمہوریت کو قبول کرنا مجبوری ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ عذرِ لنگ ہے کیونکہ اس موقف نے نہ صرف دینی قوتوں کو ناکام کیا ہے بلکہ صحیح اسلامی سیاسی جدوجہد کا (بلکہ سارے شعبہ ہائے زندگی کی اسلامائیزیشن کا) راستہ بھی روک دیا ہے۔

دیکھیے! اگر آپ مغربی جمہوریت یا برائے نام 'اسلامی جمہوریت' کو رد کر دیتے تو ملک میں غلبۂ دین کے لیے دیگر راستوں اور تجاویز کے بارے میں سوچتے اور ان پر عمل کرتے۔ اور اگر آپ اس مغربی جمہوریت میں یہ کہہ کر حصہ لیتے کہ ہم اسے غیر اسلامی سمجھتے ہیں لیکن بگاڑ اور فساد کو بڑھنے سے روکنے کے لیے اس میں مجبوراً حصہ لے رہے ہیں اور ساتھ ہی آپ غلبۂ

دین کے لیے متبادل مناہج پر غور کرتے اور ان پر عمل کرتے تو اس کے نتیجے میں غلبۂ دین کے امکانات بڑھ جاتے۔ لیکن جب آپ نے باقی سارے کام چھوڑ دیے (گو برائے نام کاغذوں میں باقی رہے) اور صرف مغرب زدہ 'اسلامی جمہوریت' کے تحت جدوجہد کی اور اس میں آپ کو ناکامی ہوئی (اور منطقی طور پر آپ کو ناکام ہونا ہی تھا) تو اب آپ بند گلی میں کھڑے ہیں، کارکن مایوس ہیں اور ان کی مایوسی بجا ہے اور آپ محض خود کو اور جماعت کو زندہ رکھنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

ان اسباب کی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ مولانا محترم کا دوسرا اجتہاد (مغرب کی الحادی سرمایہ دارانہ جمہوریت میں پیوندکاری کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دینا) بھی صحیح ثابت نہیں ہوا۔ مولانا تو اپنے ربّ کے پاس پہنچ گئے۔ ہم دوسرے اہل علم وفضل سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور اس اجتہاد پر نظر ثانی فرمائیں۔

ان وضاحتوں کے بعد اب ہم جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب سے گزارش کرتے ہیں کہ:

❁ وہ اپنے اس موقف پر نظر ثانی فرمائیں کہ مولانا مودودیؒ کا موقف یہ تھا کہ انتخابی سیاست کے ذریعے مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کا توڑ کیا جا سکتا ہے یا اس کے ذریعے غلبۂ اسلام کا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لادین اور سرمایہ دارانہ مغربی جمہوریت میں اسلام کے کچھ اصولوں کی پیوندکاری کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دینے کی غلطی بھی ان کی سمجھ میں آ جانی چاہیے کیوں کہ اگر سوشلزم کے ساتھ اسلام کے کچھ معاشی اصولوں کی پیوندکاری کر کے اسے 'اسلامی سوشلزم' کہنا غلط ہے اور سرمایہ داری کے اصولوں میں چند اسلامی باتوں کی پیوندکاری کر کے اسے 'اسلامی سرمایہ داری' کہنا غلط ہے تو لادین مغربی جمہوریت میں کچھ اسلامی اصولوں کی پیوندکاری کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' کہنا کیوں غلط نہیں؟ ہم حیران ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے معاشی نظام (سرمایہ داری) کی اتنی مذمت کرتے ہیں لیکن وہ اس کے سیاسی نظام (جمہوریت اور جمہوری انتخابات) کی مذمت نہیں کرتے؟

✿ پاکستان میں انتخابات تقریباً مغربی جمہوری اصولوں کے مطابق ہوتے ہیں اسی لیے ان کے ذریعے دینی سیاسی جماعتیں کامیاب نہیں ہوئیں اور نہیں ہوسکتیں اور نہ ان کے ذریعے اسلامی انقلاب لانا ممکن ہے۔

ہاں! چونکہ اسلام بھی شورائیت کا علم بردار ہے جس میں لوگوں سے مشورہ کرنا ضروری ہوتا ہے لہٰذا انتخابات کی ایسی شکلیں وضع کی جاسکتی ہیں جو اسلام کے مطابق ہوں (ایسی ہی ایک تجویز البرہان کے موجودہ شمارے میں پیشِ خدمت ہے) لیکن جب اسلامی قوتوں نے مغربی جمہوریت اور اس کے نظام انتخابات کو قبول کر لیا تو اب کسی دوسرے نظام انتخاب کے بارے میں کوئی کیوں سوچے؟

ڈاکٹر صاحب محترم نے ہٹلر اور مولینی کی مثال دی ہے کہ انہوں نے انتخابات جیت کر اپنے ایجنڈے پر عمل کیا تو اسلامی جماعتیں یہ کیوں نہیں کرسکتیں؟ ہم کہتے ہیں کہ ان کا پیراڈائم ایک تھا۔ ہٹلر اور مسولینی مغربی فکر وتہذیب کو چیلنج کرنے نہیں اٹھے تھے لہٰذا انہوں نے جائز و ناجائز مختلف ہتھکنڈے استعمال کر کے انتخاب جیت لیا۔ کوئی دینی سیاسی جماعت ان ہتھکنڈوں کو استعمال نہیں کرسکتی جو پاکستان کی سیکولر سیاسی جماعتیں کرتی ہیں لہٰذا وہ کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ اور اگر ان ہتھکنڈوں میں سے کچھ سادہ چیزوں کو بھی وہ استعمال کریں تو لوگ ان پر تنقید کرتے ہیں اور اسے برا اور غیر اسلامی سمجھتے ہیں جیسے جماعت کے اکثر لوگوں نے قاضی حسین احمد مرحوم کی انتخاب جیتنے کی عوامی پالیسیوں پر کڑی تنقید کی اور چونکہ عوام اسے اسلامی اقدار سے انحراف سمجھتے ہیں لہٰذا ووٹ وہ پھر بھی ان اسلامی جماعتوں کو نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی حسین احمد مرحوم کی 'لبرل' پالیسیوں کے باوجود لوگوں نے جماعت کو ووٹ نہیں دیے اور جماعت کو حسب سابق ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

✿ ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کو مسلکی دینی سیاسی جماعتوں سے اتحاد، اصلاحی تحریکوں سے حصول تائید اور مسجدوں کا وفاق بنا کر ان کی سپورٹ حاصل کر کے انتخابات جیتنے کی جو پالیسی تجویز کی ہے اس کا مولانا مودودیؒ کی فکر سے کوئی تعلق نہیں اور نہ مولانا نے کبھی اس قسم کی کوئی تجویز اپنی زندگی میں کبھی دی۔

امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہماری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے اور جماعت کو انتخابی سیاست جاری رکھنے کی جس مہم پر وہ لگے ہوئے ہیں اس پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

'نظامِ اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب'

از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۴۸ء)

....واضح طور سمجھ لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے:

ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے مخلص اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کرلیں اور ایمان داری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہوگیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہیں۔ (جنہیں ہم نے اپنے ''مطالبہ'' میں بیان کر دیا ہے)، پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے، پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہوجائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کرسکیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور وارادہ کو بتدریج اس حد تک نشو نما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقہ کو آزمارہے ہیں۔ اگر اس میں ہم کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لا حاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہو گا جو قیام پاکستان کی راہ میں انہوں نے کیں، اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطۂ نظر سے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے، جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔

(اسلامی ریاست، ص: ۷۴۰ تا ۷۴۲، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، طبع ۱۹۶۷ء)

ظاہر

لاہور

سیّد مودودی نے یہ کیا کہہ دیا؟

۱۱ اپریل ۱۹۶۹ء

سیّد مودودی نے کیا فرمایا ہے — یہ کیا کہہ دیا انہوں نے ہے — انتخابات اسلامی انقلاب کا واحد ذریعہ نہیں ہیں، اور وضاحت اس کی یوں کی کہ جمہوریت میں اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن سے کام لیا جا سکتا ہے، اگر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہم خیال بنایا جائے، اس راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کی جائے، قید و بند کی صعوبتیں بھی درپیش ہوں تو راہِ مستقیم نہ چھوڑی جائے۔ آبادی کے بڑے حصے میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر پھیلایا جائے۔ جب آبادی کی کثیر تعداد ہم خیال ہو جائے گی، تو حکمرانوں پر دباؤ ڈالا جا سکے گا اور انہیں جھکنے پر مجبور کیا جا سکے گا۔ دلیل اس کی یوں دی کہ ماضیٔ قریب میں ہندوستان سے انگریز کو بھگانے کے لیے اسے کسی انتخاب میں شکست نہیں دی گئی تھی، بلکہ رابطۂ عوام کے ذریعے ہی بھگایا گیا تھا۔

سیدِ محترم کے ان خیالات کو بار بار پڑھیے اور پھر سوچیے، کیا کہہ دیا انہوں نے؟ اس نتیجے پر پہنچے بغیر چارہ نہیں رہے گا کہ جناب سید نے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، اسے واشگاف کیا ہے اور بھٹک بھٹک کر مایوس ہو جانے والوں یا چل چل کر تھک جانے والوں کو امید سے آگاہ کیا ہے، ذوقِ سفر سے ان کا تعارف کرا دیا ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۵۔ اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ
لاہور۔ (پاکستان)

فون نمبر: ۵۲۵۰۰۸
حوالہ ......۱/۸۱۲۱......
تاریخ ....
۵ .۶.۷۲

مولانا وصی مظہر صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ میرے متعلق آپ جانتے ہیں کہ ۱۹۶۸ء سے مسلسل انحطاط نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ کوئی کام اپنی ذمہ داری پر ہاتھ میں لے کر چلا سکوں۔ آپریشن کے بعد مجھے ایک دن بھی آرام لینے کا موقع نہیں ملا۔ ۶۹ء اور ۷۰ء میں شدید محنت نے میری قوت کو گھن لگا دیا ہے۔ ۷۱ء میں وجع المفاصل اور ۷۲ء میں وجع الفواد کے سخت حملے ہوئے اور آخر کار مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اب اس نظم اور تحریک کو چلانا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس وقت سے صحت کا بگاڑ پیہم بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس حالت میں اصلاح احوال محض میرے کچھ لکھ دینے اور کہہ دینے سے نہیں ہو سکتی۔ بس دعا کرتا ہوں کہ جو کام نیک نیتی کے ساتھ خدا کے دین کی سربلندی کے لیے شروع کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو سیدھے راستے پر قائم کر دے اور جو لوگ جماعت کو چلانے والے ہیں ان کی رہنمائی فرمائے۔ میری زندگی اب آخری مراحل میں ہے۔ بہت جیا تو سال دو سال اور جی لونگا۔ آگے کام تو انہی لوگوں کو کرنا ہے۔ یہ بھی اللہ ہی کا فضل ہے کہ جماعت کے لٹریچر میں وہ سب کچھ موجود ہے جس سے آگے کے مراحل میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کی ضرورت محسوس ہو۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودی
۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ
لاہور-۱۲ (پاکستان)

فون نمبر: ۲۵۰۰
حوالہ 92
مورخہ 29.5.72

محترمی و مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ نے جن حالات کی طرف توجہ دلائی ہے ان کو میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ دور ایسے وقت آیا ہے جب میری قوتیں جواب دے چکی ہیں۔ لندن سے واپسی پر مجھے آرام لینے کا موقع نہ ملا اور حالات کی نزاکت کو دیکھ کر میں میدان جنگ میں کود گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتخابات کے پچھلے زمانے میں میں غیر متحرک رہا، حالانکہ وہ فیصلے کا وقت تھا۔ پھر انتخابات کے بعد ہی میرے اوپر وجع المفاصل کا حملہ ہوا اور کئی مہینے تک میں اس قابل بھی نہیں رہا کہ دماغ پر سوچنے کا بار ڈال سکوں۔ پھر جب کچھ افاقہ ہونے لگا اور میں نے اس پیچیدگی کو محسوس کیا جس میں جماعت اس وقت پڑ گئی ہے تو مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ میں خود شریک ہوا۔ لیکن اس سے فارغ ہوتے ہی دل کا دورہ پڑ گیا اور تجربے نے بتا دیا کہ میں اب اس بار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اب اگر جماعت کو یکسو اور متحرک کرنے کے لیے اجتماع عام یا نمائندوں کے اجتماع یا مجلس شوریٰ کے اجلاس کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے تو ان میں سے کوئی ایک تجویز رو بعمل لائی جا سکتی ہے۔ لیکن میں اب اس قابل نہیں رہا کہ اس طرح کے کسی اجتماع میں شریک ہو کر کوئی دماغی کام کر سکوں۔ مجھے تو میرے معالج نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر تم خود کشی نہیں کرنا چاہتے تو آئندہ کے لیے اس محنت سے سخت اجتناب کرو۔ اس حالت میں آپ اور جماعت کے دوسرے اہل الرائے اصحاب سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس طرح کام کرنے کی راہ نکالیں جس طرح اچانک میرے مر جانے کی صورت میں کرنا ہوتا۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء پروفیسر طارق بٹ

جماعت اسلامی اور مسلکی سیاسی جماعتوں کی شکست

یہ فطری اور عقل و منطق کا عین تقاضا ہے

اگر جماعت اسلامی اور مسلکی سیاسی جماعتیں جیت جاتیں تو ہمیں تعجب ہوتا کیونکہ انتخابات میں ان کی شکست فطری اور عقل و منطق کا عین تقاضا تھا اور ہے۔اس کے دلائل وشواہد بہت سے ہیں لیکن اگر ہم نے ان پر تفصیل سے لکھا تو ایک کتاب تیار ہو جائے گی لہٰذا ہم یہاں صرف ایک اصول کی بات کریں گے اور وہ ہے'اپنی غلطی تسلیم نہ کرنا، اپنا احتساب نہ کرنا اور اپنی غلطی کی اصلاح کر کے درست راہ اختیار نہ کرنا' آیئے اس اصول کا جماعت اسلامی اور مسلکی سیاسی جماعتوں پر اطلاق کر کے دیکھیں۔

جماعت اسلامی

جماعت اسلامی ابتداءً واصلاً دعوت واصلاح کی علمبردار ایک تحریک تھی۔مولانا مودودیؒ نے قیام پاکستان سے پہلے فرد اور جماعت کی اصلاح اور ان کی تطہیر فکر وعمل کے نتیجے میں ایک صحیح اسلامی ریاست کے قیام کا خواب دیکھا تھا۔دوقومی نظریے کی بنیاد پر تحریک پاکستان کی کامیابی اور عوام وخواص کے اسلام کے حق میں جذباتیت کے مظاہر دیکھ کر انہوں نے سوچا کہ شاید راہ راست سیاسی جدوجہد سے پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی منزل حاصل کی جاسکے اس کے لیے انہوں نے مغربی جمہوریت میں چند اسلامی اصول داخل کر کے اسے مشرف بہ اسلام کر کے اسے'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا اور پاکستان کی انتخابی سیاست میں عملاً حصہ لینا شروع کر دیا۔اس اپروچ کو شرعی لحاظ سے نامناسب اور دعوت واصلاح کے کام سے انحراف سمجھ کر جماعت کے اکثر اہل علم وفضل جماعت کو چھوڑ گئے لیکن مولانا اپنے موقف پر قائم رہے۔تاہم ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں شکست کے بعد انہوں نے اپنی رائے پر نظر ثانی کی اور جماعت کو بھی مشورہ دیا کہ سیاسی انتخابی جدوجہد ہی اقامت دین کا واحد طریقہ نہیں اور قیام پاکستان سے قبل جماعت کی پالیسی کی طرف لوٹنے کا سوچا جائے لیکن اس وقت

کی جماعتی قیادت نے جس کی اپنی اٹھان اور تربیت انتخابی سیاسی جدوجہد پر ہوئی تھی، مولانا کی اس بات کو اہمیت نہ دی اور اسے قبول نہ کیا۔ مولانا بوڑھے، بیمار اور کمزور تھے لہٰذا خاموش ہو گئے اور بعد میں راہی ملک عدم ہوئے۔ (یہ بات البرہان کئی دفعہ شواہد و دلائل کے ساتھ سامنے لا چکا ہے۔ دیکھیے مثلاً شمارہ)

۱۹۷۰ء کے انتخابات سے لے کر ۲۰۱۸ء کے انتخابات تک، یہ نصف صدی بنتی ہے جماعت نے جتنے بھی الیکشن لڑے، وہ اس میں ہاری۔ اس کی سٹریٹ پاور اور ووٹ بنک ختم ہو چکا ارکان و کارکنان مایوس ہو کر اور تھک ہار کر بیٹھ چکے بلکہ لیٹ چکے۔ قائدین بے شمار دفعہ ہار کر انتخابات میں ضمانتیں ضبط کرا چکے لیکن آفرین ہے جماعت کی قیادت پر کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہیں، اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے کو تیار نہیں۔ ہارنے کے بعد اس نے شکست کے اسباب کا جائزہ لینے کے لیے، ارکان و کارکنان کے مطالبے کے باوجود، کبھی کوئی کمیٹی یا کمیشن نہیں بنایا۔ اس کی عقل میں صرف ایک ہی بات آتی ہے کہ ہر انتخاب میں حصہ ضرور لینا ہے اور شکست ضرور کھانی ہے؟

خدا کے بندو! کیا قرآن حکیم میں کہیں لکھا ہے کہ سیاسی انتخابی جدوجہد ہی اقامت دین کا واحد ذریعہ ہے؟ کیا آپ کی رائے کو کوئی تقدس حاصل ہے؟ آخر اس پر نظر ثانی کیوں نہیں ہو سکتی؟ اور آپ اس پر نظر ثانی کیوں نہیں کرتے؟ آپ اپنا احتساب کیوں نہیں کرتے؟ خود پر تنقید کیوں نہیں کرتے اور خود سے یہ سوال کیوں نہیں پوچھتے کہ ہماری جماعت ہر دفعہ کیوں انتخابات میں ہار جاتی ہے؟ آخر آپ کو شکستوں کے کچھ اسباب تو ہوں گے؟ وہ اسباب کیا ہیں؟ اور آپ شکستوں کی اس دلدل میں کیسے نکل سکتے ہیں؟ آپ کو اگر ان سوالوں کا جواب نہیں سوجھتا تو ارکان جماعت کا اجتماع بلائیے اور ان کے سامنے مسئلہ رکھیے جس طرح کہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۵۶ء میں رکھا تھا۔ آپ قیادت سے استعفیٰ دے دیجیے جس طرح کہ مولانا مودودیؒ نے دیا تھا لیکن آپ کچھ بھی نہیں کرتے۔ بے حس اور ڈھیٹ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور جو بولے اس کی رکنیت ختم کرنے کو تیار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیا طرز عمل ہے؟ اگر آپ کو آخرت کا اور خدا کا خوف نہیں تو ہم کہتے ہیں دنیاوی لحاظ ہی سے سوچے، عقل عام سے سوچیے اور کیا دنیا میں پہننے کی یہی ریت ہوتی ہے کہ اپنی غلطی کو تسلیم نہ کیا جائے اپنا محاسبہ نہ کیا جائے

اور اپنی غلطی کو درست کرنے کا نہ سوچا جائے؟

مسلکی سیاسی جماعتیں

ہم ان کو عام لوگوں کی طرح 'دینی سیاسی جماعتیں' نہیں کہتے بلکہ انہیں 'مسلکی سیاسی جماعتیں' کہتے ہیں کیونکہ یہ درحقیقت دینی جماعتیں ہیں ہی نہیں۔ان میں سے ہر جماعت کسی نہ کسی فقہی وکلامی مسلک پر مبنی ہے بلکہ اس میں چھپانے والی کیا بات ہے، یہ امر معروف ہے کہ ہمارے ہاں 'دین' برائے نام ہے اصل چیز ہے دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث یا اہل تشیع ہونا۔ یہ سارے مسالک ہیں، مکاتب فکر ہیں، دین نہیں ہیں۔لیکن ان مسالک کے علمبردار علماء نے مسالک کے پیروکاروں کو گمراہ اور ضالّ ومضلّ سمجھتے ہیں اور ان کا بطلان اور بعض اوقات تکفیر ضروری سمجھتے ہیں۔ہم کسی پر کوئی الزام نہیں لگا رہے، ہمارے معاشرے کا ہر فرد اس بات کو دیکھتا اور جانتا ہے۔

یہاں تک کہ ہمارا 'دین' ہر مدرسہ کسی نہ کسی مسلک کا علمبردار ہوتا ہے وہ اپنے ہاں دین کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ اپنے مسلک کے سپاہی اور مبلغ تیار کرتا ہے۔اسی طرح ہماری ہر مسجد کسی نہ کسی مسلک کی علمبردار ہوتی ہے یہ مسلک اس کی پیشانی پر یعنی ہر مسجد کے گیٹ پر نمایاں انداز میں لکھا ہوتا ہے اور اس کے نام کا ایک جزء ہوتا ہے کہ یہ مسجد فلاں مسلک کی ہے۔یہی حال دینی تعلیم کے وفاقوں کا ہے کہ ہر وفاق کسی نہ کسی مسلک کا نمائندہ ہے وہ محض انتخابی بورڈ نہیں ہوتا۔ وہ دیوبندی وفاق ہے یا بریلوی تنظیم المدارس ہے یا سلفی وفاق ہے یا اہل تشیع کا وفاق ہے۔

یہی حال ہماری 'دینی سیاسی جماعتوں' کا ہے۔ان میں سے ہر سیاسی جماعت کسی نہ کسی کی علمبردار ہے۔سب جانتے ہیں کہ جمعیت علماء اسلام دیوبندیوں کی ہے۔ جمعیت علماء پاکستان بریلویوں کی جماعت ہے، جماعۃ الدعوۃ اہل حدیثوں کی ہے بلکہ ہر مسلک کے اندر کئی کئی جماعتیں ہیں۔ دیوبندیوں کی جمعیت علماء اسلام (ف)، جمعیت علماء اسلام (س)، جمعیت علماء اسلامی (حقیقی)۔ بریلوی اور اہلحدیثوں کی تو اتنی جماعتیں ہیں کہ ان کے دھڑوں کے نام رکھنا بھی کارے دارد ہے۔

مطلب یہ کہ تقسیم در تقسیم، تفرقہ در تفرقہ اور تشتت در تشتت۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں

نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔[1] لیکن ان علماء کرام کو یہ نام پسند نہیں وہ اپنے فرقے کے نام سے جانے جانا پسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا[2] لیکن ان میں سے ہر فرقہ یہ کہتا ہے کہ صرف میں صحیح ہوں باقی سب باطل ہیں اور مٹا دیے جانے کے قابل ہیں۔ یہ متحد ہونے کو تیار نہیں ان کو ہوا خیزی ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ ان کو شکست ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ اپنی فرقہ واریت سے باز نہیں آئیں گے۔ دوسروں کے لیے تعجب رکھیں گے، انہیں حقارت سے دیکھیں گے بلکہ انہیں مٹا دینا چاہیں گے۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے کتنی عقل کی ضرورت ہے کہ جو سیاسی جماعت ایک مسلک پر بنے گی تو دوسرے مسالک کے لوگ اسے ووٹ نہیں دیں گے کیونکہ ان فرقوں میں منافرت، حقارت، نفرت، تعصب پہلے سے موجود ہے۔ تو ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو کیوں ووٹ دے گا؟ موٹی عقل کا آدمی بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ مسلک کی بنیاد پر بننے والی سیاسی جماعت کبھی نہیں جیت سکی، وہ پارلیمنٹ میں کبھی اکثریت حاصل نہیں کر سکتی اور کبھی برسر اقتدار نہیں آ سکتی.... لیکن اس کے باوجود ہر مذہبی لیڈر اپنے مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعت بناتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہے سوائے اس کے کہ اسے شریعت اور دین عزیز نہیں، اپنا مسلک عزیز ہے۔ یہ رویہ عقل کے خلاف ہے، منطق کے خلاف ہے، دین کے خلاف ہے، یہ اخلاص اور فراست کے خلاف ہے لیکن ہمارے مسلکی علماء کرام یہ باتیں سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنی سیاسی جماعت اپنے مسلک کی بنیاد پر بنائیں گے۔

ہمیں اس بات کو اٹھاتے ہوئے برسوں بیت گئے لیکن علماء کرام میں سے کوئی اس بات کو سننے کو تیار نہیں۔ آخر یہ علماء کرام اپنا احتساب کیوں نہیں کرتے، اپنی غلطی کیوں نہیں مانتے؟ اپنے رویے پر نظر ثانی کیوں نہیں کرتے؟ اپنے رویوں کی اصلاح کیوں نہیں کرتے؟

---

[1] الحج ۲۲:۷۸

[2] آل عمران ۳:۱۰۳

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء محمد رشید [1]

جماعت اسلامی اور مذہبی جماعتوں کی سیاست ناکام کیوں؟

مذہبی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کا سبب

مذہبی سیاسی جماعتوں کے پاس پورے ملک کے تمام حلقوں کے کے لیے امیدوار ہی نہیں ہیں اور جو ہیں وہ اپنے حلقے کی ہی ضرورتوں کو کفایت نہیں کرتے۔ اس لیے موجودہ حالات میں یہ تو ناممکن ہے کہ مذہبی سیاسی جماعتوں کی حکومت بن سکے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اگر مذہبی سیاسی جماعتیں زیادہ سیٹیں جیت جائیں تو یہ کسی سیکولر جماعت کے ساتھ مل کر حکومت میں شامل ہو کر چند وازرتوں پر مفاہمت کر لیتی ہیں۔ پھر یہ بھی المیہ ہی ہے کہ گزشتہ ستر سالوں میں مذہبی سیاسی جماعتوں کو حاصل کوئی بھی وزارت مجموعی طور پر کوئی بھی متاثر کن کارکردگی نہیں دکھا سکی ہے۔

مذہبی سیاسی جماعتیں اگر اپنے مقصد اور اسلام کے ساتھ سنجیدہ ہوتیں تو وہ پورے ملک اور تمام صوبوں میں پہلے مرحلے میں تعلیم اور میڈیا کی وزارتوں پر اپنی نگاہوں کو فوکس کرتیں اور سارے مفادات اور اکساہٹوں کی قربانی دیتے ہوئے صرف انہی دو وزارتوں کے حصول پر زور دیتیں۔ اور ان کے ذریعے ملک کے تعلیمی نظام اور ذرائع ابلاغ میں ایسے بنیادی اوصاف پیدا کرنے پر اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیتیں کہ انہی دو وزارتوں کی عوام دوست اور اسلام دوست کارکردگی انہیں پورے ملک میں ایک مقبول اور محبوب سیاسی گروہ کی شہرت دے ڈالتی۔ انہی دو وزارتوں کے ذریعے وہ مغرب کے انسانیت کش، تہذیب کش و عالمگیریت پر مبنی چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے پوری قوم کی تربیت و تیاری کا کارنامہ سرانجام دے سکتے۔ مغرب سے بے معنی لڑائی کی بجائے دوستی اور تعاون کے کون سے میدان متعین ہونے چاہئیں اور مغرب کی اندھی بہری اطاعت اور غلامی کی بجائے آزادی و خودمختاری کا کیا دائرہ کار ہونا چاہیے؟ عوام و خواص میں ان امور کا شعور بیدا کرنے میں بھی یہی دونوں وزارتیں کلیدی

[1] ملتان، ای میل abu_munzir1999@yahoo.com

کردار ادا کرسکتی ہیں۔ نہ صرف عوام میں محبوبیت پیدا کرنے کا یہ ایک بنیادی فارمولا ہے بلکہ ملکی نظام کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے تعلیم، صحت، معیشت، عدلیہ، قانون، مالیات، بین الاقوامی تعلقات اور انتظامی امور کے لیے بہترین افراد کار بھی اسی نظام تعلیم سے تیار ہوکر مستقبل میں ان کی ایک تابناک حکومت کی بنیاد ثابت ہوسکتے ہیں۔

معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں کے پاس پورے ملک کے نظام تعلیم کو اسلامی، مقامی اور بین الاقوامی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کا کوئی نظام، اہلیت، صلاحیت، وژن اور آرزو ہی نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ ستر سالوں میں ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں نے کوئی ایک بھی ایسی کامیاب درسگاہ اور نصاب تشکیل نہیں دیا جو نظام تعلیم کو اسلامی، مقامی اور بین الاقوامی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیتا ہو، جہاں سے ایسے افراد کار تیار ہوتے جو پورے ملک کی دینی اور دنیاوی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت، جذبہ اور قابلیت رکھتے ہوں۔

ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں کی اسلام کے ساتھ غیر سنجیدگی کا سب سے بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ پاکستان بننے کے کم وبیش ۶۰ سال بعد انہیں خیبر پختونخوا میں پورے پانچ سال کے لیے حکومت ملی لیکن پورے پانچ سالوں میں تعلیم، صحت، مالیات، انتظامی امور اور عدالتی نظام کسی بھی شعبے میں وہ کوئی جوہری تبدیلی لانے میں بری طرح ناکام رہے۔ جوہری تبدیلی لانے میں ناکام کیا رہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی قابل ذکر شعبہ ہائے زندگی میں کوئی جوہری تبدیلی لانے کے لیے کسی منصوبہ بند مساعی کو بروئے کار لانے کی کوشش ہی نہیں کی۔

یہ ہے ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں کی اسلام، ملک اور قوم کے ساتھ سنجیدگی کی ایک معمولی سی جھلک۔ کیا اس سنجیدگی کے ساتھ مذہبی جماعتوں کا اتحاد الیکشن میں کوئی قابل قدر کامیابی حاصل کرسکتا ہے؟ اور اگر بالفرض انہیں کوئی واقعی یادگار کامیابی مل جاتی ہے تو اس سنجیدگی اور شرمناک ماضی کے ساتھ وہ کوئی قابل قدر خدمت سرانجام دے بھی سکتی ہیں؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جو ہم اپنی مذہبی سیاسی جماعتوں کے سامنے رکھ رہے ہیں۔

واضح رہے کہ ہماری اس تنقید سے یہ مت سمجھا جائے کہ ہم مذہبی سیاسی جماعتوں کے مخالف ہیں۔ قطعی نہیں، بلکہ ہم مذہبی سیاسی جماعتوں کو اس ملک کا نہایت قیمتی اثاثہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان جماعتوں کی قیادت نہایت بے دردی سے اس قیمتی ترین اثاثے کے ضیاع پر لگی ہوئی ہے۔ لہٰذا ہماری اس تنقید کو خود احتسابی سمجھا جائے۔

پاکستان کی ۷۰ سال پرانی جماعت کیوں ناکام ہے؟

پاکستان میں جماعت اسلامی ایک ایسی سیاسی جماعت ہے جس کے پاس بہترین پرکشش لٹریچر بھی ہے، ۷۰ سال سے سیاست میں بھی ہے، دعوت دین اور خدمت خلق میں بھی تمام سیاسی جماعتوں پر فوقیت رکھتی ہے، نہایت منظم جماعت بھی ہے، اس کی ذیلی تنظیمیں بھی بے شمار ہیں، اسے بہترین لیڈرشپ بھی ملتی رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود گزشتہ ۷۰ سال میں وہ ایک بار بھی پاکستانی سیاست میں کوئی بڑا بریک تھرو نہیں لاسکی۔ پاکستانی سیاست کو گندگی اور غلاظت سے پاک کرنے کے لیے کوئی مرکوز منصوبہ سامنے نہیں لاسکی اور آج تک ایک ملک گیر باکردار، دیانتدار اور ثابت قدم سیاسی ٹیم ہی تیار نہیں کرسکی، جس کے پاس قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کی تمام سیٹوں پر مقابلہ کرنے کے لیے امیدوار ہی نہیں ہوتے۔ جس کی دیگر سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں نہایت نمایاں اور امتیازی خصوصیات کے باوجود اسے پورے ملک میں دو چار سے زیادہ سیٹیں نہیں ملتیں۔

آپ کو معلوم ہے اس بدترین ناکامی کی کیا وجہ ہے؟ اس کی صرف اور صرف ایک ہی وجہ ہے کہ اس جماعت نے نہ ہی وقت کے تقاضوں کو کبھی کماحقہ سمجھا ہے اور نہ ہی دین کے تقاضوں کو۔ بلکہ یہ ہمیشہ بین بین پیچ ہی میں الجھی رہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب ایک جماعت خود ہی اتنے الجھاؤ اور باہم کشمکش کا شکار ہو تو عوام کو وہ خاک یکسوئی عطا کرے گی۔ لہٰذا اسی کا نتیجہ ہے کہ عوام نے اس کے خدمت خلق اور خدمت دین کو احترام کی نظروں سے دیکھنے کے باوجود اس کے سیاسی دعووں اور الیکشن مہم کو کبھی بھی ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ عوام ہی کیا بلکہ بعض اوقات تو خود اس جماعت کے بعض کارکنوں اور راہنماؤں نے بظاہر سیاسی کمپین تو جماعت کی چلائی لیکن درحقیقت جماعت مخالف امیدوار کو جتوانے کی بھرپور کوشش کی۔

اگر یہ جماعت واقعی ایک زندہ جماعت بن کر رہنا چاہتی ہے اور پاکستان کی سیاست میں واقعی کوئی قابل ذکر تبدیلی لانا چاہتی ہے تو اسے میرٹ، انصاف، آزادی رائے، احترام

انسانیت اور دکھی انسانیت سے ہمدردی کو محض زبان سے نہیں بلکہ اپنے کردار، اپنی تنظیم، اپنی تحریک اور اپنی ترجیحات کے ذریعے ثابت کرنا ہوگا۔

موجودہ جمہوری نظام کی ناکامی کیا ہے؟

مذہبی جماعتوں کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ موجودہ جمہوری نظام ایک ناکام سسٹم ہے۔ بے حس، بددیانت، خودغرض، عوامی مفادات کے دشمن، ذاتی مفادات کے غلام، ترقی کے نام پر عوام کی بنیادی ضرورتوں کو بدترین "بھوک" کا شکار بنا دینے والے اور اپنے ذاتی اثاثوں میں ہوشربا اضافے کرنے والے لوگ ہی سسٹم پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس تناظر میں یہ نظام ایک بدترین نظام قرار پاتا ہے۔ اس نظام کو بہترین سسٹم میں تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ صرف اور صرف عوامی فلاح و بہبود سے محبت کرنے والے دیانتدار لوگ ہی قیادت کے اہل قرار پائیں۔ ایک مسلم اکثریتی ملک کے کسی بھی قسم کے سیاسی نظام (بشمول جمہوری نظام) میں یہ خوبی صرف اور صرف اسلام کے اصولوں کی پیروی ہی کی صورت میں پیدا کی جاسکتی ہے۔ افسوس! پاکستان کے آئین میں اس کی ضمانت تو دی گئی ہے لیکن اس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کوئی بھی جماعت بشمول دینی سیاسی جماعتیں بھی اس پر عمل کرنے کرانے میں کوئی سنجیدہ لائحہ عمل تشکیل نہیں دیتیں۔ بس صرف زبانی جمع خرچ ہی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

ایم ایم کی سب سے بڑی ناکامی

مولانا فضل الرحمان کا نام سیاست کو مذہب کے نام پر مال اور مفادات سمیٹنے کا ذریعہ سمجھنے والوں کے لیے سمبل بن چکا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ دعویٰ سو فیصد درست ہے۔ لیکن ایم ایم اے کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کو اس اتحاد کی مرکزی قیادت سونپی ہے جو سیاست میں بدترین الزامات کے زد میں رہا ہے، جس کا کردار، دین و سیاست ہر دو حوالوں سے قطعی غیر مثالی رہا ہے۔ جو بے نظیر، مشرف اور پھر نواز شریف تمام باہم متضاد حکومتوں سے مفادات و وزارتیں لینے کے ماہر تصور کیے جاتے ہیں۔ بھلا ابن الوقتی کی سیاست اور کس بلا کا نام ہے؟

ایم ایم اے کی سب سے بڑی ناکامی ہی یہ ہے کہ انہوں نے ابن الوقتی کی سیاست کے سب سے بڑے ماہر محترم مولانا فضل الرحمان کو اس اتحاد کی مرکزی قیادت سونپی ہے۔

سیاسی سوجھ اور فراست کا قحط یا کچھ اور؟

کیا ہمارے کسی مذہبی رہنما کو یہ توفیق ملی کہ وہ بنگلہ دیش کے اسلام پسندوں کی غیر قانونی اور ظالمانہ پھانسیوں پر نواز شریف کی گونگی حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا کہ ان تمام اسلام پسندوں کو پاکستان سے محبت کے جرم میں پھانسیوں پر لٹکایا جا رہا ہے تو یہ بین الاقوامی قوانین کی بھی کھلی خلاف ورزی ہے لہٰذا پاکستان اس کے خلاف بھرپور احتجاج کرے اور بنگلہ دیش کے سفیر کو وارننگ دے۔ کیا ہماری کسی بھی مذہبی شخصیت نے اس نہایت جائز مطالبے پر سٹینڈ لیا؟ اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ اپنی بے حسی توڑ کر عالمی برادری کے سامنے احتجاج کرے اور بنگلہ دیش کے سفیر کو ہی کم از کم ملک بدر کر دے۔ افسوس! ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب صرف اور صرف بنگلہ دیشی اسلام پسندوں کی پھانسیوں کا انتظار کرتے رہے اور جب وہ پھانسیوں پر چڑھ گئے تو صرف سراج لالہ اس پر مرثیہ ونوحہ پڑھتے رہے اور رسمی احتجاج کرتے رہے۔ صاحبو! اس سیاسی سوجھ بوجھ اور فراست کے ساتھ اگر ہمارے یہ محترم قائدین پاکستانی قوم کی قیادت کے لیے میدان میں اتریں تو بھلا کوئی بتائے کہ ہم ان پر کیسے بھروسہ کریں؟

یم ایم اے کے پہلے دور حکومت کی "برکات"

ایک صوبہ کی حکومت کے عوض مشرف کو پاکستان میں بدترین دہشت گردی کے بیج بونے کی کھلی چھٹی دے دی۔ مشرف تو امریکہ سے حق دوستی نبھار ہا تھا اور ایم ایم اے مشرف کے ساتھ نورا کشتی کر کے اپنے مفادات کے ساتھ حق دوستی نبھا رہی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہی فوج جو پاکستان کے تحفظ کی علامت سمجھی جاتی تھی اسی کے خلاف نفرت اور دہشت گردی کی تحریک اسی ملک سے شروع کی گئی اور اس کا بیس کیمپ وہی صوبہ تھا جس پر ایم ایم اے کی حکومت تھی۔ مشرف اور ایم ایم اے والے اتنے معصوم اور بھولے تھے کہ ان کو پتہ ہی نہیں تھا کہ جو اقدام وہ کر رہے ہیں (لال مسجد سانحہ، امریکی بلیک واٹر کو ہزاروں کی تعداد میں ویزے دینا اور ایم ایم کی محض ڈنگ ٹپاؤ بیان بازی) اس کا نتیجہ پاکستان میں بدترین دہشت گردی کی صورت میں نکلے گا۔ دشمن طاقتوں کو پاکستان میں پاکستان کے امن اور پاکستان کی فوج کے خلاف بدترین نیٹ ورک بنانے کا موقع ملے گا۔ لیکن یہ تمام خدشات جائیں بھاڑ میں، مشرف اور ایم ایم اے کو تو اپنے اپنے مفادات عزیز تھے سو وہ اپنے اپنے مفادات کشید کرنے میں

لگے رہے اور پاکستان لہولہو ہوتا رہا۔

ایم ایم اے فکری افلاس کی علامت؟

ایم ایم اے کے نام سے مذہبی جماعتوں کا سیاسی اتحاد ان کی بالغ نظری کی نہیں بلکہ فکری افلاس کی علامت ہے۔ کیونکہ ایسے کسی بھی اتحاد کی ضرورت سیاسی میدان سے زیادہ غیر سیاسی میدان میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں آج مسلمانوں کو اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان کے مختلف مسالک اور فرقوں کے راہنما ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنا کر اپنے باہمی اختلافات کو ریشنلائز کر کے باہمی رواداری کو فروغ دیں، نہ کہ مسلکی اور فرقہ وارانہ اختلافات کی آگ کو ٹھنڈا کیے بغیر محض سیاسی مفادات کی خاطر اتحاد بنا کر اقتدار کے جھوٹے خواب دیکھے اور دکھائے جائیں۔ جھوٹے خواب دیکھنے اور دکھانے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ مذہبی جماعتوں کے اتحاد کو انتخابات میں بدترین شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے اور عوام نے ان اتحادوں کے مرکزی رہنماؤں کو اٹھا کر دیوار پر دے مارا ہے۔ اس بنا پر ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ مذہبی طاقتوں کو بے وقعت کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ خود مذہبی سیاسی جماعتوں کا ہے۔ اور یہ بھی کہ خیبر پختونخوا میں ایم ایم اے کی بدترین شکست نے ان کے سیاسی شعور اور ایمانی فراست کے افلاس کو طشت از بام کر دیا ہے۔ یہ فکری افلاس نہیں تو اور کیا ہے کہ سوات سے ایم ایم اے اپنے ایک مضبوط امیدوار سے ٹکٹ واپس لے کر شہباز شریف کی حمایت کا اعلان کرتی ہے یعنی وہ جماعت جس کی کرپشن اور بدانتظامی کا خود مذہبی جماعتیں رونا رہتی ہیں، عین الیکشن کے دوران اسی کرپٹ جماعت کے مرکزی رہنماؤں کی حمایت کی جاتی ہے۔ پھر بونیر میں بھی ایم ایم اے کی بعض جماعتوں نے مسلم لیگ ن سے اتحاد کر لیا۔ جی وہی جماعت جس کے دور حکومت میں ہمسایہ مسلم ملک کے اسلام پسندوں کو پھانسیاں دی جاتی رہیں اور اس جماعت کی حکومت نے ان ظالمانہ پھانسیوں کو رکوانے کے لیے زبانی احتجاج تک کرنا گوارا نہ کیا۔ اپنے منشور اور مقصد سے بدترین غیر سنجیدگی کا ثبوت خود یہی مذہبی جماعتیں اپنے متضاد کردار کے ذریعے فراہم کرتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوات میں ایم ایم اے کا "چوروں" کے حق میں دستبردار ہونے اور ان سے غیر اعلانیہ اتحاد کے باوجود انہیں بدترین شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ عوام نے قول و فعل کے اس تضاد پر اپنی ناپسندیدگی کی مہر لگا دی۔

اسی لیے ہمارا ماننا یہ ہے کہ اہل مذہب جب تک اپنی اخلاقی پستی اور ذہنی افلاس سے نجات حاصل نہیں کریں گے بلکہ آنے والا ہر دن ان پر ذلت اور ناکامی کا کوڑا برساتا رہے گا۔صاحبو! اقوام عالم میں ہم مسلمانوں کی اور پاکستان میں مذہبی جماعتوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ اخلاقی پستی اور ذہنی افلاس ہے۔ہم زور دے کر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ سیاست زعم پارسائی دکھانے کا نہیں بلکہ عوام کی نگہبانی وتحفظ کے عزم میں اپنی سنجیدگی ثابت کرنے کا نام ہے۔افسوس! مذہبی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کا راز ان کے اپنے ہی اندر ہے لیکن وہ اسے باہر کی دنیا میں تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ہم اگر مذہبی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کو ایک جملے میں کہنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ عوام مذہبی سیاسی جماعتوں سے اس لیے مایوس اور نالاں ہیں کہ وہ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔

تو کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟

مذہب کا کام سیاست کو روشنی، رہنمائی اور پاکیزگی عطا کرنا ہے نہ کہ گندی اور غلیظ سیاست کا آلہ کار بننا۔افسوس! ہم مذہب کو پہلے کام کے لیے نہیں بلکہ دوسرے کام کے لیے نہایت بے دردی سے استعمال کر رہے ہیں۔نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ چاروں طرف سے ناکامی ونامرادی جبڑے پھاڑ کر ہمارے استقبال کے لیے تیار کھڑی ہے۔تو کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟

دوسری مذہبی جماعتوں کو چھوڑیئے اگر صرف جماعت اسلامی کرپشن کے خاتمے میں عمران خان کی غیر مشروط حمایت کرتی اور ایک بھی سیٹ مانگے بغیر مثبت ایجنڈے میں پی ٹی آئی کو سپورٹ کرتی تو آج اخلاقی لحاظ سے وہ بہت طاقتور پوزیشن میں ہوتی۔لیکن افسوس! سیاسی شعور کے افلاس، قول وفعل کے تضادات، حب عاجلہ، منصوبہ بندی اور دوراندیشی کے بدترین فقدان نے دینی جماعتوں کی سیاست کا جنازہ نکال کر رکھ دیا ہے۔سیاست کے بازار میں اہل مذہب اپنے گنبد میں بند کامیابی کے جھوٹے خواب دیکھ اور دکھا رہے ہیں جبکہ ہر گزرتا دن ان پر بدترین ناکامی اور بربادی کا کوڑا برسا رہا ہے۔اخلاقی پستی اور فکری افلاس اس ناکامی اور بربادی کے منحوس چکر کا سبب بھی ہے اور سب سے بڑی علامت بھی۔

پاکستان اور اسلام / انتخابات ۲۰۱۸ء　　　محمد دین جوہر

دینی جماعتیں، سیاسی عمل اور اقتدار

حالیہ انتخابات میں مذہبی سیاسی جماعتوں کی شکست پر عام سوال یہ اٹھا کہ لوگ انہیں ووٹ کیوں نہیں دیتے؟ جوابات اور ردعمل بہت متنوع تھے۔ گزارش ہے کہ اس موضوع پر کچھ بنیادی سوالات کو دیکھ لیا جائے تو شاید جواب کی طرف پیشرفت ہو سکے۔ بنیادی سوالات تو صرف دو ہیں: کیا ان جماعتوں کا سیاسی عمل مذہبی اعتبار سے درست ہے؟ کیا ان کا سیاسی عمل جدید سیاست کے اسالیب پر پورا اترتا ہے؟

"مذہبی سیاست" اصلاً ان دو سوالوں کے لاینحل الجھاؤ سے پیدا ہوئی ہے اور اس نے ہماری دینی روایت اور سیاسی عمل دونوں کو متاثر کیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں متداول تمام مذہبی سیاسی تصورات اور عمل کا شجرہ نسب تحریک وہابیت سے مل جاتا ہے جو ہمارے ہاں پہلی جدید اصلاحی اور سیاسی تحریک تھی۔ مابعد تمام مذہبی سیاسی تحریکوں کا واحد ماڈل یہی ہے۔ اس تحریک کی طرح مذہبی سیاسی جماعتیں اصلاً "اصلاحی جماعتیں" ہیں جو سیاست بھی کرتی ہیں۔ تحریک وہابیت کا طریقۂ کار وعظ اور تلوار سے معاشرے کی "اصلاح" تھا۔ مابعد مذہبی جماعتوں میں یہ "دعوت دین" اور "سیاسی عمل" کے طور پر سامنے آیا۔ ہر مذہبی سیاسی جماعت ایک خاص تصورِ دین کی حامل ہے جس کی رو سے معاشرے کا بنیادی مسئلہ "بے دینی" ہے۔ اس بنیادی موقف کی وجہ سے مذہبی سیاسی جماعتوں کا مسلم معاشرے اور عام مسلمان سے تعلق مخاصمانہ ہے۔ مذہبی سیاست کے نتائج میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ مذہبی سیاست کی وجہ سے عقیدے کے بارے میں مذہبی سیاسی قوتوں کے سامنے جوابدہی کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے عقیدے کی نوعیت سیاسی اور سیکولر ہوگئی ہے اور اس کی مذہبی حیثیت تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ اس تناظر میں مذہبی سیاسی جماعتوں نے معاشرے کی سیکولرائزیشن میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

گزارش ہے کہ قومی سیاسی عمل، ہر جدید عمل کی طرح بیک وقت منقسم اور منظم ہوتا ہے۔ قومی سیاسی عمل کے چار بڑے اجزا ہیں: ریاست، سرمایہ، پارٹی پولٹکس اور میڈیا۔ فی الوقت

پارٹی پولٹکس زیر بحث ہے۔ پارٹی پولٹکس کے دائرے میں واقع ہونے والے سیاسی عمل کے تین اجزا ہیں: لیڈر، بیانیہ اور عوام۔ جدید سیاسی عمل اپنے پھیلاؤ کی وجہ سے غیر معمولی انتظامی، فکری اور معاشی وسائل کا تقاضا کرتا ہے، اور جدید سیاسی جماعتیں اس عمل کے ہر پہلو میں متحرک ہوتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو درپیش صورت حال عملی، واقعاتی اور فیصلہ کن ہوتی ہے اور ہر قدم پر لیڈر کی رہنمائی کا تقاضا کرتی ہے۔ بیانیہ عملی جدوجہد میں پھریرے کا کام کرتا ہے، جسے عام طور پر منشور یا مظہر یہ (مینی فیسٹو) کہا جاتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے برصغیر میں جدید سیاسی عمل مغرب سے درآمد شدہ ایک بالکل نئی اور استعماری چیز تھی۔ مسلمانوں میں زیادہ تر سیاسی اور مذہبی جماعتیں بیسویں صدی کے نصف اول میں قائم ہوئیں اور ان تمام جماعتوں نے سسٹم کی معین شرائط پر ہی سیاسی عمل میں شرکت اختیار کی۔ جدید سیاسی عمل اور نظام کی کوئی مثال ہماری تاریخ اور روایت میں نہیں ہے۔ برصغیر میں جدید سیاسی عمل اور نظام کے قیام کے بعد ان کے بارے میں ایک غیر متعلق اور الل ٹپ فتویٰ بازی تو چلتی رہی ہے، لیکن مذہبی تناظر میں کوئی کام کی بات آج تک سامنے نہیں آئی۔ سیاست، سرمایہ، اور میڈیا وغیرہ مذہبی علوم میں ابھی تک "نامعلوم" کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لیے روایتی مذہبی مواقف کا "نامعلوم" جدید سیاسی عمل اور نظام پر اطلاق کرنا درست نہیں، اور عین یہی کام کرنے سے ہماری قومی صورت حال لاینحل اور سنگین ہوگئی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں سامنے آنے والی سیکولر یا نیم سیکولر سیاسی جماعتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، اول مذہبی جماعتوں کو مذہبی تناظر میں دیکھنا چاہیے:

۱۔ پہلا توسیعی سوال یہ ہے کہ کیا جدید سیاسی عمل میں شرکت کے لیے ریس اور نقل کی بنیاد پر سیاسی پارٹی بنانا جائز ہے جبکہ یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ ہے کیا؟ سیاسی پارٹی اور اس کی میکانیات خود ایک بالکل جدید چیز ہے۔ پارٹی اور پارٹی پولٹکس کے بارے میں شریعت کی کیا رہنمائی ہے؟ پھر جدید سیاسی پارٹی کے لیڈر، بیانیے اور عوام کے تصورات کی شرعی معنویت اور حیثیت کیا ہے؟ پارٹی پولٹکس میں "حزب اختلاف" ایک نیا تصور ہے، اور اس کی شرعی حیثیت بھی غیر متعین ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ہماری مذہبی سیاسی جماعتیں بھی غیر مسلم معاشروں کی سیاسی پارٹیوں کی نقل اور چربے سے تیار ہوئی ہیں، اس میں شریعت کی رہنمائی کیا ہے؟ یعنی کیا برطانوی لبرل پارٹی یا کمیونسٹ پارٹی کا مذہبی چربہ تیار کرنا جائز تھا؟ پارٹی پولٹکس کا ایک بڑا مقصد ریاست کے پہلے سے قائم مستقل سیاسی نظام پر کنٹرول حاصل کرنا ہے۔ کیا مذہبی طور پر

پارٹی پولٹکس اور ریاست کا باہمی تعلق طے شدہ ہے؟

برصغیر میں جدید سیاسی عمل اور نظام کے قیام کے بعد ان کے بارے میں ایک غیر متعلق اور الل ٹپ فتویٰ بازی تو چلتی رہی ہے، لیکن مذہبی تناظر میں کوئی کام کی بات آج تک سامنے نہیں آئی۔ سیاست، سرمایہ، اور میڈیا وغیرہ مذہبی علوم میں ابھی تک "نامعلوم" کا درجہ رکھتے ہیں۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا طاقت، سرمائے اور میڈیا کے وسیع تر اور گلوبل نظام کے مقامی مظاہر میں مکمل طور پر انہی کی طے کردہ شرائط پر شریک ہونا شرعی لحاظ سے جائز ہے؟ یعنی ایک ایسا نظام جو ہماری مذہبی فکر اور فقہ وغیرہ میں علم کی کسی بھی معروف شرط پر مکمل "نامعلوم" ہے؟ ہم ایک باہم متوسل دنیا میں رہتے ہیں، اور کسی ملک یا ریاست کو ایک منفک اور آزاد اکائی سمجھنا اور اس پر فیصلہ دینا سنگین نوعیت کی مشکلات رکھتا ہے۔ ہر مذہبی سیاسی موقف میں اس امر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ عدم واقفیت کی بنیاد پر سیاسی موقف بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳۔ مذہبی جماعتیں "عقیدے اور شناخت کی سیاست" میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ اس میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا منہجِ خوارج پر سیاسی عمل کا طریق کار عقیدے اور شناخت پر استوار کرنا اور اجتماعی عدل کے شرعی احکامات کو نظر انداز کرنا مذہبی طور پر جائز ہے؟ مذہبی جماعتوں کا تاریخی اور معاشرتی حالات سے سروکار نعرے سے زیادہ نہیں ہے، اور ان کے سیاسی علوم نظریۂ سازش پر مبنی ہیں۔ مذہبی جماعتیں عام طور پر 'نفاذ اسلام' کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ اس سے عمومی مراد عقیدہ اور عبادات وغیرہ ہیں اور اس کی سیاسی معنویت اور مقصد تقوے کا جبری نفاذ ہے۔ کیا سیاسی عمل کا مقصد اجتماعی عدل کا قیام ہے یا تقوے کا جبری نفاذ؟ اس میں شرعی رہنمائی کیا ہے؟ مذہبی سیاست نے دینی فکر اور اعمال صالحہ کے لیے معاشرے میں موجود گنجائش کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

۴۔ مذہبی معنوں میں یہ امر جزوی طور پر بھی طے شدہ نہیں ہے کہ ووٹ کیا چیز ہے؟ شرعاً یہ بھی معلوم نہیں کہ ووٹ دینا جائز ہے یا ناجائز؟ ووٹ پر مذہبی فتوے کی نوعیت یہ ہے کہ کُل معلوم نہیں اور جز پر فتویٰ جاری ہے، جیسا کہ مولانا روم کے ہاتھی کا معاملہ رہا۔ ووٹ جیسے شرعی طور پر مابہ النزاع مسئلے کی موجودگی میں مذہبی جماعتوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ جدید سیاسی

عمل اور سرمائے کے نظام پر کوئی مذہبی یا فکری موقف رکھتے ہوں گے، بالکل عبث ہے۔ نااہلیت اور لاعلمی میں کی جانے والی مذہبی'سیاسی جدوجہد' کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۵۔ ہیئت حاکمہ اور قانون کا باہمی تعلق معروف ہے۔ جدید دنیا میں ہر ہیئت حاکمہ سیکولر ہے، اور عین اسی ہیئت حاکمہ سے'اسلامی قانون' کے نفاذ کا مطالبہ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ مذہبی قانون کے نفاذ کے مطالبے میں متداول قوانین کے تقریباً سو فیصد استعماری ہونے کو نظرانداز کر دیا گیا۔ مذہبی سیاسی جدوجہد میں جو قوانین منظور کرائے گئے، ان کی حیثیت استعماری قانونی مجموعے میں ایک مذہبی دم چھلے کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مذہبی اور استعماری قانون کے ملغوبے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۶۔ یہ پوچھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ مذہبی معنوں میں "قوم" اور "ملک" کیا ہوتا ہے؟ "قوم" کا تصور تو بہت کانٹے کی بحث کا موضوع رہا ہے اور اس میں "مذہبی" دادِ سخن نہ صرف افسوسناک رہی بلکہ اس نے مسلمانوں کے سیاسی سفر کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ موجودہ مذہبی سیاسی ڈسکورس بھی ملکی سالمیت کے لیے خطرناک مضمرات رکھتا ہے۔ "ملک" کی بحث تو شکر ہے چلی ہی نہیں، کیونکہ اس پر مذہبی سیاسی طبقے نے چپ سادھ لی کیونکہ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ بھی کسی بحث کا موضوع ہوسکتا ہے۔ گاہے گاہے داعشی خیالات کی آڑ میں ملک کو غیر مستحکم کرنے کی کوششیں ضرور ہوتی رہی ہیں۔ اس میں بنیادی سوال یہ ہے کہ مذہبی سیاسی تصورات کا بنیادی تناظر کیا ہے؟ اور جدید تاریخی صورت حال سے اس کی نسبتیں کیا ہیں؟

۷۔ جدید مذہبی سیاسی خیالات کی آڑ میں کچھ گروہ پاکستان کی طرح مسلم ممالک اور معاشروں کے خلاف نبردآزما ہیں، اور اکثر قتل و غارت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ معروف سیاسی ذرائع کی موجودگی میں یہ اعمال نہ صرف غیر شرعی ہیں، بلکہ غیر انسانی بھی ہیں۔ مسلم کش مذہبی سیاسی تصورات پر مذہبی سیاسی جماعتوں کا کیا موقف ہے اور ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۸۔ مذہبی سیاسی جماعتیں جمہوری عمل میں شریک بھی ہوتی ہیں اور جمہوری تصورات کو غیر مذہبی قرار دے کر ان کے خلاف کام بھی کرتی ہیں۔ یہ کیا چیستاں ہے؟

اب ان جماعتوں کے سیاسی اہداف اور منشور کو دیکھنا بھی مفید ہوسکتا ہے۔ ان جماعتوں کا سب سے بڑا ہدف ملک میں "اسلامی قانون" کا نفاذ ہے، اور ان کا سیاسی عمل اس نفاذ کی جدوجہد

قرار دیا جاتا ہے۔ اصلاً یہ ہدف ایک مطالبے کی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن یہ مطالبہ کس سے ہے؟ طاقت کے اس نظام سے جو اپنی ہیئت اور اساسی فکر میں مکمل مغربی ہے، اور مذہبی فکر میں ابھی تک "نامعلوم" ہے؟ سیاسی عمل، ٹریڈ یونین ازم نہیں ہوتا جسے صرف مطالبوں تک محدود رکھا جا سکے۔ سیاسی عمل ایک ذمہ داری ہے جس کا ہدف اقتدار کا حصول ہے۔ ہدف پر پہنچ کر مقاصد کے حصول کا آغاز ہوتا ہے۔ استعمار سے متوارث طاقت کے نظام کو تبدیل کرنے کی بجائے اس سے کچھ مطالبات کرنا، اس سسٹم کی قبولیت کا جواز ہے۔ سیاسی عمل کسی قانون کے نفاذ کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ سیاسی طاقت کے حصول اور کچھ قومی مقاصد کے لیے ہوتا ہے جس میں اجتماعی عدل اور معاشی ترقی سب سے اہم ہیں۔لیکن عقیدے کی سیاست نے اجتماعی عدل کے تمام مقاصد ہی کو اوجھل کر دیا، اور ترقی کو ناپسندیدہ قومی عمل بنا دیا۔ مذہبی جماعتوں کی مستقل احتجاجی کارکردگی کی وجہ سے معاشرے کا پورا سیاسی عمل غیر متوازن ہو کر رہ گیا ہے اور قومی سیاسی مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ مذہبی سیاست کا سب سے زیادہ نقصان مذہب کو پہنچا۔

مذہبی جماعتوں کی "مطالباتی" سیاست نے انہیں پریشر گروپس کی حیثیت دے دی، جن کا مقصد ریاست اور قائم سیاسی حکومت کو مسلسل دباؤ میں رکھ کر عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنا ہے۔ مذہبی جماعتوں کی مستقل احتجاجی کارکردگی کی وجہ سے معاشرے کا پورا سیاسی عمل غیر متوازن ہو کر رہ گیا ہے اور قومی سیاسی مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ مذہبی سیاست کا سب سے زیادہ نقصان مذہب کو پہنچا۔ مذہب میں ایمان اور عقیدہ اساسی چیز ہے۔ ایمان ایک ذاتی چیز ہے، اور عقیدہ علم کا موضوع ہے سیاست کا نہیں۔ چونکہ انسان کی مذہبی شناخت سے کچھ سماجی اور معاشی پہلو جڑے ہوئے ہیں، اس لیے عقیدے کا ایک پہلو قانونی بھی ہے۔لیکن مذہبی سیاست نے عقیدے کو پبلک اور میڈیائی چیز بنا دیا ہے۔ مذہبی سیاست کی وجہ سے عقیدے کے معاملے میں لوگوں کو مطمئن کرنا اور ان کی خیر سگالی حاصل کرنا اب زیادہ اہم ہے۔ عقیدہ عبد و معبود کے جس تعلق کا بیان ہے وہ اب زیادہ اہم نہیں رہا۔ مذہبی سیاست کی وجہ سے عقیدے کے بارے میں مذہبی سیاسی قوتوں کے سامنے جوابدہی کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے عقیدے کی نوعیت سیاسی اور سیکولر ہو گئی ہے اور اس کی مذہبی حیثیت تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ اس تناظر میں مذہبی سیاسی جماعتوں نے معاشرے کی سیکولرائزیشن میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ (دانش ڈاٹ کام)

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

اُسامہ الطاف

اسلامی سیاست ناکام کیوں؟

۱۴۵۳ء میں سلطان محمد الفاتح کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی آزادی کے بعد وہاں کے مفکرین، سائنسدان اور دانشور یورپ روانہ ہوگئے۔ مفکرین کی یورپ آمد کو جدید تاریخ (ماڈرن ہسٹری) کی ابتدا کہا جاتا ہے۔ جدید تاریخ مسلمانوں کے لیے نیک شگون ثابت نہیں ہوئی۔ یورپ میں مضبوط جمہورتیوں کے قیام اور صنعتی انقلابات نے مغرب کو مسلمانوں کے مقابلے میں سیاسی، عسکری اور معاشی طور پر کافی مضبوط کردیا۔ مغرب اور مسلمان ممالک کے درمیان طاقت کا توازن بگڑنے کے نتیجے میں "مغربیت" اسلامی ممالک کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر غالب آگئی، حتی کہ مسلمان ذہن بھی مغربی تہذیب کے اسیر ہوگئے۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب ہزیمت شدہ مسلم معاشرہ ہر اجنبی نعرہ کو قبول کررہا تھا، مارکسزم اور قومیت کا خوب چرچا تھا، لبرل سوچ کو پذیرائی مل رہی تھی اور عوام الناس کی اکثریت بنیادی دینی احکام سے بھی بے بہرہ تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مصلحین کی کوششوں سے مسلمانوں کے ذہن اجنبی سحر سے آزاد ہونے لگے۔ ماکسزم، لبرلزم اور قومیت کے ضعیف تصورات کی حقیقت واضح ہونے لگی اور رفتہ رفتہ اکثریت ان کھوکھلے افکار کی قیود سے آزاد ہوگئی۔ جدید تاریخ کی ابتدا میں اسلامی معاشرے کو لگنے والے دھچکے کے آثار اب کافی حد تک کم ہوگئے ہیں، تاہم سیاسی میدان میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد اسلامی سوچ کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کرسکی، خلافت واپسی کی تحریکیں ناکام ہوئیں تو اسلامی سیاسی جماعتوں نے چھوٹے پیمانے پر ملکی سطح پر اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ مختلف ممالک میں اسلامی سوچ کی حامل جماعتوں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر یہ تجربہ بھی ناکام رہا۔ کچھ ممالک میں عوام نے اسلامی جماعتوں کو بالکلیہ مسترد کردیا، کچھ ممالک میں عوام نے موقع دیا لیکن اسلامی جماعتیں کارسرکار چلانے میں اور اپنا ایجنڈا نافذ کرنے میں ناکام رہیں۔ اور کچھ ممالک میں اسلامی سوچ کی حامل سمجھی جانی والی جماعتوں نے نیم سیکولر حلیہ اپنالیا اور اپنے اصولوں پر سمجھوتہ

کرلیا۔ نتیجتاً اسلامی دنیا میں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر شریعت کے نفاذ کی کوئی قابل اتباع مثال قائم نہیں ہوسکی۔

اسلامی سیاسی جماعتوں کی ناکامی ان کی سیاسی سوچ کا نتیجہ ہے۔ بدقسمتی سے اسلام پسندوں کی اکثریت (عام مذہبی شخص سے سیاسی قائدین تک) سیاسی اہداف کا صحیح تجزیہ کرنے سے قاصر اور سیاسی منظر نامے کو پڑھنے سے عاجز نظر آتی ہے۔ لہٰذا قیادت کے فیصلے بھی سیاسی عدم بصیرت پر مبنی ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں نہ صرف متعلقہ جماعت سیاسی طور پر کمزور ہوتی ہے بلکہ مجموعی طور پر اسلامی سیاسی جماعتوں پر منفی اثر پڑتا ہے۔

دیگر جماعتیں اقتدار کے حصول کے لیے اصول پامال کرتی ہیں جبکہ جماعت اسلامی والے اس بد سلیقہ انداز سے اصول توڑتے ہیں کہ ان کے ہمدرد بھی بدظن ہوجاتے ہیں۔ پاکستان میں متحدہ مجلس عمل کا قیام اسلامی جماعتوں کی سیاسی عدم بصیرت کی ایک مثال ہے۔ پاکستان میں مذہبی حلقوں کی نمائندہ دو بڑی سیاسی جماعتیں ہیں: جمعیت علماء اسلام اور جماعت اسلامی۔ جمعیت علماء اسلام کی قیادت کی غیر سنجیدگی، غیر شفافیت اور سابقہ کردار کی بنیاد پر ان سے اسلامی سیاست میں کوئی قابل ذکر اقدام کرنے کی امید معدوم ہے۔ قائد جمعیت کی حیثیت ملک کی دو بدنام پارٹیوں کی قیادت کے درمیان ایلچی کی ہے۔ اس کے برعکس جماعت اسلامی کی قیادت میں اخلاص اور حب الوطنی کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور جماعت کی قیادت کا دامن بدعنوانی کے الزامات سے بھی پاک ہے۔ لیکن سیاسی عدم بصیرت کا عارضہ جماعت اسلامی کی قیادت کو بھی لاحق ہے۔ جس کی وجہ سے جماعت کی عوامی مقبولیت انتہائی کم ہے۔ متحدہ مجلس عمل کا قیام اس عارضہ کی علامت ہے۔ جماعت اسلامی گزشتہ انتخابات کے بعد قومی سطح پر اپوزیشن کی صف میں کھڑی ہوئی۔ خیبر پختونخوا میں قومی اپوزیشن کی فعال جماعت کے ساتھ اتحادی حکومت تشکیل دی اور چار سال اپنی پالیسی پر عمل درآمد کیا۔ اب جب انتخابات میں صرف چند ماہ باقی رہ گئے تو جماعت اسلامی کی قیادت نے قلابازی کھائی اور حکومتی صف میں شامل جماعتوں کے ساتھ اتحاد قائم کرلیا۔ صوبائی سطح پر جس حکومت کا جماعت اسلامی حصہ تھی، انتخابات میں جماعت اسلامی اسی حکومت کے خلاف کھڑی ہوگئی۔ جماعت اسلامی کی قیادت کا خیال تھا کہ ووٹر اس سیاسی مذاق کو مذہب کے نام پر قبول کرلیں گے۔ ستم

ظریفی یہ ہے کہ جماعت اسلامی کا ووٹر سے یہ پہلا مذاق نہیں ہے۔ اس سے قبل جماعت اسلامی اپنی سیاسی حریف مسلم لیگ ن سے آزاد کشمیر کے الیکشن میں اتحاد کرچکی ہے۔ اسپیکر اور چیئرمین سینٹ کے انتخاب میں بھی جماعت اسلامی نے اپنے اصولوں کی خلاف ورزی کی۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ جماعت نے شخصی میرٹ پر ووٹ ڈالا۔ یہ سبب ہی جماعت کی سیاسی عدم بصیرت کو ظاہر کرتا ہے، جو شخصیت کو اس کی پارٹی سے علیحدہ دیکھتی ہے۔ جماعت اسلامی کی قیادت کے مبہم مواقف کی بنا پر ووٹر جماعت کو سنجیدہ نہیں لیتا۔ دیگر جماعتیں اقتدار کے حصول کے لیے اصول پامال کرتی ہیں جبکہ جماعت اسلامی والے اس بدسلیقہ انداز سے اصول توڑتے ہیں کہ ان کے ہمدرد بھی بدظن ہوجاتے ہیں، یہاں کارکنان کی ذمہ داری ہے کہ وہ قیادت کے غلط فیصلوں پر مؤاخذہ کریں۔ لیکن بدقسمتی سے جذباتی کارکنان قیادت کے فیصلے کے پیش نظر اپنے سابقہ حلیفوں کی کردارکشی اور نئے حلیفوں کے دفاع میں مصروف ہیں، جسے دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ سیاسی عدم بصیرت کا لاحقہ سرطان کی طرح پوری تنظیم میں ہی پھیلا ہوا ہے۔ جمعیت علماء اسلام کی قیادت کی غیر سنجیدگی، غیر شفافیت، اور سابقہ کردار کی بنیاد پر ان سے اسلامی سیاست میں کوئی قابل ذکر اقدام اٹھانے کی امید معدوم ہے۔

عالمی سطح پر اسلام پسندوں کی سیاسی عدم بصیرت کی مثال ترکی صدر رجب اردگان سے والہانہ محبت وعقیدت کا جذبہ اور ان کو مثالی قائد کی تصویر میں پیش کرنے کی کوشش ہے۔ اردگان کے لیے اسلام پسندوں کے معیار اور اصول تبدیل ہوجاتے ہیں۔ پاکستان میں امریکی ہوائی اڈے قائم کرنے اور امریکی جنگ میں شرکت کرنے پر مشرف کو کٹھ پتلی حکمران کا لقب دیا گیا (جو کہ کافی حد تک صحیح تھا)۔ نواز شریف نے جب پاکستان کو لبرل ملک بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تو سوشل میڈیا پر طوفان برپا ہوگیا (ہونا بھی چاہیے تھا)۔ عمران خان کو جلسوں میں موسیقی کا رواج عام کرنے پر کڑی تنقید کا سامنا ہوتا ہے (اور ہونا بھی چاہیے)۔ لیکن انہی تین 'جرائم' کا ارتکاب جب اردگان کرتا ہے تو نامور علماء بھی حیلے تلاش کرتے ہیں، بہانے گڑھتے ہیں اور اردگان کے دفاع میں گویا قمر الزمان کائرہ کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ترکی میں امریکی ہوائی اڈہ آج بھی موجود ہے جہاں سے شامی معصوموں پر بمباری ہوتی ہے۔ ترکی کے وزیر اعظم اعتراف کرچکے ہیں کہ امریکا نے جب افغانستان میں مدد طلب کی تو ہم نے بغیر

لیت ولعل کے اپنے فوجی روانہ کیے جو آج تک وہاں مسلمانوں کے قتل میں شریک ہیں۔شام کو تباہ کرنے والے ایران اور روس سے ترکی کے برادرانہ تعلقات ہیں اور تینوں ممالک ایک دوسرے کے حلیف سمجھے جاتے ہیں۔اسرائیل اور ترکی کے درمیان تجارتی، تعلیمی، سفارتی ہر طرح کے تعلقات بحال ہیں۔جبکہ ہمارے جذباتی اسلام پسند اردگان کی بیت المقدس سے متعلق صرف تقریر کا ترجمہ سن کر عش عش کرتے ہیں۔ترکی کی شامی شہر عفرین میں حالیہ کارروائی بھی اردگان حمایتی میڈیا پروپیگنڈا کا موضوع رہی حالانکہ یہ کارروائی شامی حکومت نہیں کردوں کے خلاف تھی جو شام، ایران، عراق اور ترکی کے مشترکہ حریف ہیں۔اسلام پسندوں کی سیاسی عدم بصیرت سے اردوان اور دیگر موقع پرست اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں، پھر وقت گزرنے کے بعد اسلام پسندوں کو ہوش آتا ہے کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوگیا، یا بالفاظ دیگر یہودی سازش، خفیہ ہاتھوں اور عالمی طاقتوں نے اپنا کام کر دکھایا۔

اسلامی سیاست کی ناکامی ہر مسلمان کے لیے المناک ہے،لیکن اس ناکامی کے پیچھے اسلام پسندوں کی ہی منحرف سیاسی سوچ کارفرما ہے۔جس دن یہ سوچ صحیح ہوگئی، اسلامی سیاست بھی کامیاب ہوجائے گی۔

بقیہ: متحدہ مجلس عمل اپنے اصل مشن کی طرف لوٹ آئے

ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ دینی جماعتوں نے اپنے آپ کو انتخابی سیاست کے لیے وقف کر دینے سے اپنے دامن میں اس نظام کی غلاظتوں کو سمیٹنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔حالیہ عبرت ناک شکست کے بعد انہیں اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور اپنے اصل مشن کی طرف واپس لوٹ آنا چاہیے۔دعوت الی اللہ کا مشن، اسلام کے دفاع کا مشن، تعلیم وتربیت کا مشن، فلاح ورفاہ کا مشن، اللہ تعالیٰ، ان کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مسلمانوں کے حکمرانوں اور عوام کی نصیحت وخیر خواہی کا مشن، اس کی بدولت ہی وہ اپنی ساکھ بحال کرسکیں گی اور اسلام، ملک اور عوام کی بہتر خدمت کرسکیں گی۔(ماہنامہ المنبر فیصل آباد)

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء 'نقیبِ سحر'

اسلام کو پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں سے بچاؤ

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین صرف اس قابل ہیں کہ انہیں اٹھا کر بحر ہند میں پھینک دیا جائے کیونکہ وہ چلو بھر پانی میں ڈوبنے کو تیار نہیں

❁ ہم نے مدیر البرہان سے کئی دفعہ کہا ہے کہ آپ اپنی عادت سے مجبور ہیں کہ جب بھی پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کی شکست یا ان کی اسلام کش پالیسیوں کا ذکر ہو آپ اسے ایک علمی فکری موضوع بنا دیتے ہیں جب کہ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین کے پاس اتنی ''فالتو'' عقل ہے ہی نہیں کہ وہ علمی وفکری باتوں پر غور کریں۔ 'فالتو عقل' کے الفاظ ہم نے سوچ سمجھ کر استعمال کیے ہیں کیونکہ یہ قائدین ویسے تو بہت ذہین اور ہوشیار بلکہ عیار ہیں کیونکہ اگر وہ ذہین اور عیار نہ ہوتے تو وہ کیسے اتنے طویل عرصے سے پاکستان کے سادہ لوح مسلمانوں کو دغا دینے اور اسلام کو چونا لگانے میں کامیاب ہوتے؟

❁ ہم پہلی بات یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ 'دینی سیاسی جماعتیں' درحقیقت صرف 'سیاسی جماعتیں' ہیں۔ 'دینی سیاسی جماعتیں' کہلوانا محض ان کا ''برانڈ'' ہے جو انہوں نے بڑی محنت سے اپنے کاروباری اور مالی مفادات کے لیے مشہور کر رکھا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح کی سیاسی جماعتیں ہیں جن کے پیش نظر 'اسلام آباد' ہے 'اسلام' نہیں۔ اسلام بے چارہ تو ایک ''پروڈکٹ'' ہے جسے یہ 'اسلام زندہ باد' کے نعرے لگا کر بیچتے ہیں۔ مارکٹنگ کے جدید اصولوں کے مطابق انہوں نے اپنی پروڈکٹ کے نہایت دلکش، خوبصورت اور جاذب (اٹریکٹو) نام رکھے ہوئے ہیں جیسے 'نظامِ مصطفیٰ'، 'اسلامی انقلاب'، 'نفاذِ شریعت'، 'اسلامی نظام' وغیرہ۔

❁ یہ اتنے ہوشیار اور کامیاب بزنس مین ہیں کہ اپنے بزنس میں نقصان کا ذرا سا رِسک لینے کو تیار نہیں۔ اس لیے ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ انہوں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ان کو ٹھیکہ دینے والی کمپنی کی ایم ڈی ہے امریکی سی آئی اے اور اس کے ڈائریکٹروں میں اسرائیل کی موساد، بھارت کی را اور افغانستان کی این ڈی ایس شامل ہیں جبکہ پاکستانی سی آئی ڈی اس کی ریجنل

ڈائریکٹر اور مقامی سی ای او (چیف ایگزیکٹو آفیسر) ہے۔ انہوں نے ٹھیکہ اس چیز کا لے رکھا ہے کہ وہ کبھی متحد نہیں ہوں گے۔ نام اسلام کا لیں گے لیکن ان کا اصل فوکس ان کا مسلک اور فرقہ ہوگا اور چونکہ فرقہ واریت خیر سے دادا اُستاد یعنی استعمار (انگریز) کے عہد زریں سے چلی آرہی ہے لہٰذا اس کے لیے کسی محنت کی ضرورت ہی نہیں۔ بس اس آگ پر وقفے وقفے سے تھوڑا سا تیل ڈالتے رہنا ہے کہ فرقہ واریت کی یہ آگ ہمیشہ بھڑکتی رہے اور انتخابات میں دینی ووٹ تقسیم ہوتا رہے تاکہ مقامی کالے انگریز سیاستدان آسانی سے انتخابات جیتتے رہیں اور مغرب کی پالیسیاں اور اس کی فکر و تہذیب مملکت خداداد پاکستان میں نافذ کرتے رہیں۔

اس ڈرامے میں ولن کا کردار مولانا فضل الرحمن مدظلہ العالی ادا کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں بلکہ انہیں ذاتی اور جماعتی مفادات کے لیے حکومت میں شامل اقتدار ہونے کا فن بھی خوب آتا ہے چنانچہ مشرف کی آمریت ہو، بینظر کی دہریت ہو یا نواز شریف کی برائے نام اسلامیت ہو، وہ ہر جگہ فِٹ ہوجاتے ہیں اور اپنے لیے اور اپنے بھائیوں کے لیے کوئی نہ کوئی وزارت یا کمیٹی کی چیئر مینی لے اڑتے ہیں۔ ان کے کمال کی حد یہ ہے کہ انہوں نے موروثی قیادت کے تسلسل میں زرداری اور نواز شریف کا مقابلہ کرنے میں بھی کامیابی حاصل کرلی ہے اور قومی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر کے عہدے پر اپنے بیٹے کو الیکشن لڑایا ہے۔ اگرچہ اس انتخاب میں صاحبزادے کی ہار یقینی تھی لیکن مولانا اس چیز کے قائل ہیں کہ سیاست میں کچھ نہ کچھ تو ملنا ہی چاہیے چنانچہ انہوں نے اپنے صاحبزادے کو سیاست میں ایک بڑی انٹری دلوادی ہے اور کامیابی ملے نہ ملے، کمپنی کی مشہوری تو بہت ہوگئی نا۔ ہم مولانا کے حامیوں کے اس موقف کی بھی تائید کرتے ہیں کہ مولانا کو 'مولانا ڈیزل' کہنا ان کے مخالفین کا پروپیگنڈا ہے کیونکہ جب مولانا کے مدّمقابل زرداری صاحب برطانیہ میں سرے محل بنا رہے تھے اور نواز شریف لندن میں کروڑوں کے لگژری فلیٹس خرید رہے تھے اس وقت اگر مولانا نے قانونی طور پر کچھ ڈیزل کے پرمٹ لے بھی لیے تھے تو اس میں مولانا کے خلاف مکروہ پروپیگنڈا کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ روٹی تو بہرحال کما کھائے مچھندر!

انتخابات ۲۰۱۸ء کے بعد مولانا عمران خاں کی جیت کے خلاف احتجاجی تحریک چلانے میں سب سے آگے تھے اور ناکامیوں کے باوجود اب بھی آگے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا غصہ

حق بجانب ہے کیونکہ انہیں انتخابات میں نہ صرف دونوں نشستوں سے شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے بلکہ وزیروں کے محلے میں وہ کوٹھی بھی خالی کرنا پڑی ہے جس میں وہ پچھلے ۱۳ سال سے رہ رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ سراسر ظلم ہے اور جہاں آدمی ۱۳ سال سے فری کھاتے میں رہ رہا ہو، وہاں سے نکلتے ہوئے تکلیف تو ہوتی ہے اور تکلیف کی حالت میں رونا چیخنا تو انسان کی فطرت ہے لہٰذا مولانا کا غصہ قابل فہم ہے۔ اگرچہ کئی لوگوں نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ اس ذاتی غصے کو قومی غصے میں تبدیل نہ کریں لیکن یہ بہرحال مولانا کی اپنی صوابدید ہے۔

توہینِ رسالت: ہالینڈ کے خاکے

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔ یہ مسلمانوں کا دورِ زوال ہے۔ چونکہ ان کی اپنی کوئی عزت نہیں لہٰذا وہ اپنے پیغمبر کی عزت کی رکھوالی بھی نہیں کر سکتے۔ ۵۷ مسلمان ممالک کے حکمرانوں میں دینی غیرت وحمیت ہوتی اور ان کے ۵۷ ممالک سے ہالینڈ کے سفیروں کو نکال دیا جاتا، یہ ۵۷ ممالک ہالینڈ کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیتے اور وہ او آئی سی، عرب لیگ، اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں متفقہ قرارداد مذمت لاتے تو ہم دیکھتے کہ ہالینڈ کیسے ٹس سے مس نہیں ہوتا؟

مسلمانو! دوسری زندہ قوموں سے ہی عبرت پکڑو۔ امریکہ کے ایک پادری کو ترکی اس کے جرائم کی وجہ سے نہیں چھوڑ رہا تو امریکہ نے دنیا میں طوفان اٹھا دیا ہے۔ ترکی کے خلاف عالمی سطح پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں اور اس کی معیشت بحران سے دوچار ہے لیکن ہمارے ۵۷ مسلمان ممالک کے حکمران خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ عوام احتجاج کر رہے ہیں۔ اپنی ہی املاک جلا رہے ہیں۔ اپنی ہی پولیس سے گولیاں کھا کر شہید ہو رہے ہیں لیکن ظاہر ہے اس سے مغرب کو اور ہالینڈ کو کیا فرق پڑتا ہے؟ الٹا وہ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار (مدیر)

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء　　بدر شاہین

متحدہ مجلس عمل اپنے اصل مشن کی طرف لوٹ آئے

متحدہ مجلس عمل کے احیاء کا جب فیصلہ کیا گیا تو ہم نے اسے بنی اسرائیل کے سامری کے بنائے ہوئے بچھڑے سے تشبیہ دیتے ہوئے اسے [illegible] قرار دیا تھا۔ حالیہ انتخابات کے نتائج نے ہمارے اس تجزیے کو درست ثابت کر دیا ہے۔ ایم ایم اے کی قیادت دھاندلی کا جتنا بھی رونا رولے، اسے یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ انتخابی سیاست میں وہ اپنے عروج کا دور دیکھ چکی۔ قومی مجرم کے عہد میں ایک صوبائی حکومت کا حصول اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں اس کے اراکین کا بڑی تعداد میں پہنچ جانا جیسے تیسے بھی ممکن ہوا، یہ تصور کرنا کہ وہ کبھی دوبارہ بھی اتنی بڑی کامیابی حاصل کر پائے گی، خیال است و محال است و جنوں کے مترادف ہوگا۔

ایم ایم اے کی حکومت نے تب کے صوبہ سرحد میں اسلامی اندازِ حکمرانی کو متعارف کروایا ہوتا، باقی جماعتوں کی نسبت بہتر نظام قائم کیا ہوتا، نظام کی خرابیوں کی اصلاح کی ہوتی، پاکستان کے عوام کو یہ دکھلا دیا ہوتا کہ صوبہ سرحد (خیبر پی کے) باقی تینوں صوبوں کی نسبت ہر شعبۂ زندگی میں بہتری کی راہ پر گامزن ہے تو یقینی طور پر ایم ایم اے نہ صرف صوبہ سرحد میں دوبارہ جیت جاتی بلکہ پورے ملک میں بھی اس کی حکمرانی کی راہ ہموار ہو جاتی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ ایم ایم اے حکومت کے لچھن باقی صوبوں کی حکومتوں سے کچھ مختلف نہ رہے۔ الزامات کی وہ بوچھاڑ جو دوسری جماعتوں کے سیاست دانوں اور حکمرانوں پر ہوتی رہی، اس سے ایم ایم اے کی حکومت کے بیشتر لوگوں کا دامن بھی نہ بچ سکا۔ اس اتحاد کی سب سے بڑی جماعت کے اندازِ سیاست نے دینی سیاست کو بھی مطعون کر کے رکھ دیا۔ حالیہ انتخابات میں اسی بڑی جماعت کے قائد اپنی دو نشستیں ہارنے کے بعد جو جارحانہ انداز اپنا چکے ہیں، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں دین و وطن سے کہیں زیادہ اپنی ذات اور اپنے مفادات عزیز ہیں اور ان کی خاطر وہ سب کچھ کو داؤ پر لگانے کے لیے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۱۵۵)

پاکستان اور اسلام/انتخابات ۲۰۱۸ء

تحریر: سید خالد جامعی
تلخیص: پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان میں جمہوریت کے ذریعے اسلام نہیں آ سکتا

دینی سیاسی جماعتوں (جماعت اسلامی، ایم ایم اے، تحریک لبیک وغیرہ) کے تصورات کا جائزہ

[یہ سید خالد جامعی صاحب کا ایک طویل مقالہ ہے جس کی تحریر ابھی جاری ہے۔ البرہان کے موجودہ شمارے میں دیگر مضامین کی مناسبت سے اس مقالے کے منتخب حصے دیے جا رہے ہیں۔ بنیادی مقالہ سوال و جواب کی شکل میں ہے۔ اگر اس تلخیص میں ربط کی کمی نظر آئے تو ادارہ اس کے لیے معذرت خواہ ہے۔ مدیر]

لبیک یا رسول اللہ (TLYR) نے بھی عورتوں کو الیکشن میں کھڑا کر دیا

انتخابی سیاست کی مجبوری

تحریک لبیک یا رسول اللہ کے بارے میں تو مذہبی جماعتوں کی رائے ہے کہ یہ سب سے زیادہ سخت گیر (Right Hard Liner) جماعت ہے ہم دین میں اتنے متشدد نہیں ہیں جیسی تحریک لبیک لیکن اتنی زبردست مذہبی عصبیت رکھنے والی جماعت بھی ایک ہی الیکشن کے اندر اسلامی روایت، مسلمہ علمیت، اجماع امت سے صَرفِ نظر کر کے عورتوں کو پارلیمنٹ کے الیکشن کے لیے نامزد کر دے، تو یہ حیران کن بات ہے۔ کلثوم نواز کے خلاف تحریک نے پہلا الیکشن لڑا تو اس کی خواتین انتخابی مہم چلانے باہر نکلیں۔ حضرت نے حکم دیا کہ عورتوں کے پاس جاؤ ووٹ مانگو تحریک پھر بھی ہار گئی۔ اب ۲۰۱۸ء کے الیکشن میں ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اب تحریک کی عورتیں الیکشن میں کھڑی ہو گئیں یعنی مخلوط پارلیمنٹ میں جائیں گی۔ یہ مسئلہ نہیں ہے تو تحریک جو پاکستان کو مدینہ میں بدلنے آئی تھی خود جمہوریت سے بدل رہی ہے۔ اس کا نام تحریک لبیک یا رسول اللہ تھا، الیکشن کمیشن نے اس کا نام ُلبیک پاکستان' کر دیا تو تحریک نے اسے قبول کر لیا۔ جمہوریت میں داخل ہوتے ہی مصلحت، مصالحت، مفاہمت، اصول پر سمجھوتے کا عمل غیر شعوری طور پر خود بخود شروع ہو گیا۔ یہی تو جمہوریت کا کمال ہے۔

جمہوریت میں شرکت کرتے ہی اسلامی جماعتیں خودبخود بدل جاتی ہیں

اسی لیے امریکا کہتا ہے کہ اسلامی تحریکیں جمہوریت میں شامل ہوں۔ جب شدید مذہبی عصبیت رکھنے والی جماعت اس تحریک لبیک قدر مصالحت (Compromise) کرسکتی ہے تو کم مذہبی عصبیت رکھنے والی جماعتیں جیسے ایم ایم اے وغیرہ تو بہت زیادہ مصالحت کرلیں گی۔ اس صورت میں اسلامی علمیت اور تاریخ کا کیا ہوگا۔ جماعت الدعوۃ بھی اہلِ حدیث جماعت ہے جو جہاد اور احادیث کے معاملے میں کسی مصالحت کی قائل نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا جہاد صرف مقامی، علاقائی، سرحدی پاکستانی اور ہندی ہے عالمی جہاد نہیں۔ احادیث کے معاملے میں نہایت متشدد ہے لیکن کسی حدیث سے ثابت نہیں ہوتا کہ عورت الیکشن لڑسکتی ہے، اسمبلی میں مردوں کے درمیان بیٹھ سکتی ہے، اسمبلی کے اجلاس کے لیے اسلام آباد کیلیے شرکت کرنے جاسکتی ہے، وزیر بن سکتی ہے لیکن جماعت الدعوۃ نے بھی خواتین کی نشستوں پر امیدوار کھڑے کیے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغرب کے اصول، اقدار پر تو مغرب کسی مصالحت کے لیے تیار نہیں صرف ہم ہی اسلام کے اصول، اقدار، روایات پر مصالحت کے لیے آمادہ ہیں۔ یہ ہماری ناکامی ہے اور مغرب کی زبردست کامیابی۔ ایران میں یہی ہوا شیعہ مکتب فکر کے یہاں روایات میں عورت سے کوئی روایت نہیں ملتی مگر ایران میں عورت پارلیمنٹ میں گئی وزیر بنی اب صدر بننا چاہتی ہے ۲۲ عورتوں نے صدارتی امیدوار کے کاغذات جمع کرائے آیت اللہ خامنہ ای نے صدر بننے نہیں دیا کل وہ صدر بن جائے گی رہبر کونسل کے خلاف بغاوت کردے گی۔ سوال یہ ہے کہ خمینی صاحب کی زندگی تک وہ رکن کیوں نہیں بن سکی اب رکن بن گئی ہے تو صدر کیوں نہیں بن سکتی اسلام تبدیل ہو رہا ہے اسلام مغرب کو تبدیل نہیں کررہا یہ کام علماء کررہے ہیں افسوس ہے۔

اسی لیے صدر جارج بش نے افغانستان پر حملہ کرتے وقت کہا تھا کہ طالبان ہماری آزادی کے دشمن ہیں وہ ہماری آزادی جمہوریت سے نفرت کرتے ہیں امریکا دنیا کے ہر تاریک غار میں جمہوریت کی شمع روشن کردے گا لہٰذا امریکا کا تمام اسلامی تحریکوں، جماعتوں سے سوسال سے یہی مطالبہ ہے کہ وہ جمہوریت میں شامل ہوں، انتخابات میں حصہ لیں اگر عوام انھیں منتخب کرلیں تو وہ حکمران بن جائیں امریکا کو معلوم ہے کہ جمہوری عمل میں شرکت کے بعد

ایک بھی مذہبی جماعت اپنی توحید خالص، پر قائم نہیں رہ سکے گی اپنے تمام منصوص احکام میں تغیر کرے گی۔ حالات، مصلحت، ضرورت، بڑے شر سے بچنے کے لیے چھوٹے شر کو اختیار کرنے، بلوہ عام، مضرت سے بچنے کے لیے سب اسلامی احکامات، اقدار، روایات، شریعت میں اجتہاد کریں گے جس کے نتیجے میں شریعت خود بخود سیکولرائز اور لبرلائز ہوگی یعنی دینی جماعتیں جو دین کی محافظ ہیں وہ خود ہی شریعت میں مغرب کی خواہش کے مطابق ایسے راستے پیدا کریں گی جس سے مغرب کا عقیدہ آزادی مضبوط مستحکم ہوگا اسے توسیع حاصل ہوگی۔ لہٰذا ہر وہ مذہبی جماعت جو جمہوری سیاست میں داخل ہوئی ہے اس کے اندر خود شعوری غیر شعوری طور پر تبدیلیاں شروع ہوجاتی ہے دعوت اسلامی کے مولانا الیاس نے بہت عمدہ بات کہی تھی میرے بعد دعوت اسلامی کو ختم کرنا ہو تو اعلان نہ کرنا اسے سیاسی جماعت میں تبدیل کردینا خود بخود ختم ہوجائے گی جماعت الدعوۃ اور تحریک لبیک کی جانب سے عورتوں کی انتخابات میں شرکت اس کا تازہ ترین ثبوت ہے۔

جماعت اسلامی اور جماعت الدعوۃ کی خواتین پر دو اہم کتابیں

مولانا مودودی کی کتاب پردہ، تفہیم القرآن، رسائل ومسائل پڑھ لیجیے۔ مولانا مودودی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ عورت کونسل، پارلیمنٹ کی ممبر نہیں بن سکتی اس کا مقام گھر ہے لیکن جماعت اسلامی کی بہت سی خواتین آج لوکل کونسل، صوبائی وقومی اسمبلی میں موجود ہیں تو اسلامی علمیت کم زور ہوئی یا مضبوط جماعت اسلامی نے اپنے امیر کے مؤقف کو مانا یا اس سے انحراف کیا مودودی صاحب کا یہ مؤقف ابھی تک کتابوں میں موجود ہے آئندہ یہ مؤقف کتابوں میں رہے گا یا نہیں معلوم نہیں کیوں کہ مغرب کی تقلید کی لہر چل پڑی ہے۔ جمعیت علماء اسلام (ف) کی عورتیں پارلیمنٹ میں موجود ہیں تو کیا مغرب کی آزادی کی قدر (Value) آزادی کا عقیدہ اسلامی علمیت میں جگہ بنا رہا ہے یا اسلامی علمیت آزادی کے عقیدے کو دعوت مقابلہ (Challenge) دے رہی ہے ظاہر ہے اسلام پسپا ہو رہا ہے اسلامی علمیت مصالحت کر رہی ہے۔ اسلامی علمیت اپنی تاریخ، تہذیب، اقدار، روایات سے انحراف کر رہی ہے یہ انحراف مجبوری میں ہے، حالت اضطرار میں ہے، مصلحت وقت ہے، زماں ومکان کی تبدیلی کے باعث ہے، عارضی حکمتِ عملی ہے مغرب کو صرف دھوکہ دیا جا رہا ہے کہ جنگ میں دھوکا دینا جائز

ہے یہ سب دلائل اسلامی جماعتوں کے مفکرین دے سکتے ہیں لیکن ان دلائل کی کوئی حیثیت نہیں یہ سب دلیلیں اسلامی علمیت سے انحراف کی تائید میں ہیں وہ علماء جو خلافت عثمانیہ کے اجماع کو حجت سمجھتے ہیں تو خلافت عثمانیہ کے تمام مکاتب فکر کے علماء نے تو جمہوریت کو کفر قرار دیا تھا تو کیا راسخ العقیدہ علماء اور جماعتوں کے لیے خلافت عثمانیہ کا اجماع بھی حجت نہیں ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اجماع اب ماخذ دین ہے بھی یا نہیں؟ یعنی انتخابی سیاست اور مصلحت مصالحت کی روش نے اجماع پر بھی ایک سوال اُٹھا دیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور کہاں آ پہنچے ہیں اللہ ہمارے ایمان کی اور اسلامی علمیت کی حفاظت فرمائے۔ جماعت اسلامی پاکستان اور جماعت الدعوۃ کی متقی پردہ دار عورتیں کس طرح لبرل سیکولر ہو رہی ہیں اس کے لیے صرف دو کتابیں پڑھ لیجیے امریکا سے شائع ہونے والی حمیرا اقتدار کی کتاب اور پاکستان سے شائع ہونے والی امینہ جمال کی کتاب دونوں کا موضوع یہی ہے مذہبی عورتوں کے ذریعے سیکولرازم لبرل ازم کس طرح اسلامی شکل میں پھیل رہا ہے یہ سب جمہوریت کا کارنامہ ہے۔

(1) Jamaat-e-Islami Women in Pakistan : Vanguard of a New Modernity.

(2) Secularizing Islamists : Pakistani Jamaat Islami Woman & J. Dawa in urban Pakistan

منشور انسانی حقوق اور جمہوریت اور آزادی کے تحت مذہبی آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہب پر عمل کی مکمل آزادی بلکہ مذہب کے صرف اس حصے پر عمل کی آزادی جو منشور انسانی حقوق، جمہوریت، جدید ریاست اور آزادی کے عقیدوں سے نہ ٹکرائے ورنہ مذہب کے ایسے حصے پر عمل کی آزادی نہیں ہوگی مسلمانوں کے دور میں خلافت عثمانیہ میں عیسائی، یہودیوں، پارسیوں کو اپنے مذہب کے اکثر حصے پر بھی عمل کی آزادی تھی لیکن یہ آزادی صرف غیر مسلموں کے علاقوں کے اندر محدود تھی وہاں ان کی اپنی عدالتیں، اپنا تعلیمی نظام، اپنی تہذیب، معاشرت، اقدار پر عمل کی مکمل آزادی تھی معاشرتی اور اجتماعی امور میں غیر مسلم، ذمی، معاہد اسلامی شریعت کے پابند تھے۔

التزموا احکامنا فیما یرجع الی المعاملات

مثلاً اہل ذمہ کو سودی لین دین کی اجازت نہیں تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران والوں

کے معاہدے میں تصریح کی تھی کہ اگر وہ سود کھائیں گے تو معاہدہ ختم ہو جائے گا اس لیے اسلامی امارت کے علاقے میں غیر مسلم اپنے علاقے میں سودی معاملات نہیں کر سکتے۔ امام سرخسی کا قول ہے [illegible] یعنی سود ہر معاہدے سے مستثنیٰ ہے اور عمران خان کی فلاحی ریاست مدینہ میں عمران نے اقتدار سنبھالنے سے پہلے ہی اسد عمر کے ذریعے سودی قرض لینے کا اعلان کر دیا مغرب، UNO، امریکا، منشور انسانی حقوق نے انسانی حقوق کے نام پر تمام مذاہب عالم اور اسلام پر عمل کی آزادی چھین لی ہے اس کے باوجود ہم جمہوریت آزادی کے عقیدوں کے قصیدے پڑھ رہے ہیں کیوں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہم جاہل ہی رہنا چاہتے ہیں اور مغرب کی تقلید بھی کرنا چاہتے ہیں۔

سوال: بعض علماء اور مذہبی جماعتوں نے کہا ہے کہ انتخابات معرکہ جہاد ہیں اس جہاد میں حصہ لینا سب پر فرض ہے ایم ایم اے نے کہا ہے کہ یہ کفر و اسلام کی جنگ ہے اس بارے میں آپ کا کیا مؤقف ہے؟

جواب: انتخابات جہاد ہیں اگر اس مذہبی دلیل کو مان لیا جائے تو

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ اسلامی علمیت میں جہاد عورت پر فرض ہے یا مرد پر یہ کون سا جہاد ہے جس میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ جہاد کرنے پولنگ اسٹیشن پر آ گئی ہیں جہاد صرف مرد پر فرض ہے عورت پر کب سے اور کیسے فرض ہو گیا؟ جہاد کے لیے اٹھارہ سال کی عمر کیسے آ گئی ابو جہل کو قتل کرنے والے بچے جہاد کر رہے تھے وہ تو اٹھارہ سال کے نہیں تھے لہٰذا بچے بھی جہاد میں حصہ لے سکتے ہیں آپ نے بچوں کو جہاد سے کیوں محروم کر دیا ایسا جہاد جس پر اس قوم کی سالمیت، بقاء، کا انحصار ہے اس میں تو ہر صاحبِ استطاعت کو حصہ لینا چاہیے۔

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ الیکشن کے جہاد کا آغاز صبح آٹھ بجے سے شام چھے بجے تک پولنگ کے ذریعے ہوا کیا دس گھنٹے کے اس جہاد میں کسی پولنگ اسٹیشن پر نماز کا وقفہ دیا گیا؟ کیوں نہیں دیا گیا؟ کیا انتخابی عملے کو مسجد جا کر با جماعت نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی؟ کیا انتخابی عملہ بیلٹ باکس چھوڑ کر پولنگ اسٹیشن کے اندر ہی با جماعت نماز پڑھ سکتا تھا؟

انتخابی اصول اور قواعد کے مطابق پولنگ کے اوقات میں نماز کا کوئی وقفہ نہیں تھا نماز پڑھنا نہ پڑھنا یہ فرد کا ذاتی معاملہ ہے ریاست کا اس سے کیا تعلق۔ جان لاک نے اپنی کتاب

Two Treatises of Government میں تو یہی لکھا ہے کہ جب اللہ نے اس دنیا میں ایک فرد کو آزادی دی ہے کہ وہ جنت یا جہنم جہاں جانا چاہتا ہے اس کا راستہ اختیار کرسکتا ہے تو ریاست کو مجسٹریٹ کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ کسی فرد کو جنت میں جانے پر مجبور کرے اگر کوئی جہنم میں جانا چاہتا ہے تو اسے جہنم میں جانے دو ریاست اس راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالے الیکشن کمیشن نے اسی پالیسی کو اختیار کیا ہے۔

سوال: چلیے جہاد کو حالت اضطرار نہیں کہہ سکتے لیکن جہاد کو جہاد تو کہا جاسکتا ہے لہٰذا اگر جہاد کی خاطر باجماعت نماز ترک کردی جائے کہ جہاد اسلام کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے تو اس میں کیا ہرج ہے؟

جواب: پہلی بات ہی بنیادی طور پر غلط ہے کہ الیکشن زندگی اور موت کا مسئلہ ہے جو شخص یا عالم یہ سمجھتا ہے کہ ہر پانچ سال بعد ہونے والے انتخابات اسلام کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ تو فلسفہ سیاسیات سے واقف ہے نہ جدید فلسفہ ریاست و حکومت سے واقف ہے نہ وہ جدید مغرب میں قومی ریاستوں کی تاریخ سے واقف ہے نہ اس نے Fedralist Papers کا مطالعہ کیا ہے نہ اس نے مغرب میں جمہوریت پر ہونے والی تنقید پڑھی ہے نہ اس نے پوسٹ ماڈرن ازم کی جمہوریت، عقلیت، جدیدیت پر تنقید پڑھی ہے جمہوریت اور الیکشن کا اسلام سے، جہاد سے اور زندگی وموت سے کیا تعلق یہ تو ایک سیاسی تماشہ (Political Festival) ہے جس میں ہر پانچ سال بعد ایک آدمی ایک پرچی پر نشان لگا کر سمجھتا ہے کہ اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے اگلے پانچ سال تک یہ جمہوری نظام اسے پوچھتا تک نہیں نہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ اسمبلی میں کیا ہو رہا ہے وہ اپنے قومی صوبائی اسمبلی کے رکن کو تک نہیں جانتا نہ کبھی اسے کوئی مشورہ دیتا ہے نہ وہ اس کا مشورہ سننے کے لیے تیار ہے اور اس احمقانہ نظام کو آپ زندگی موت کا مسئلہ بتارہے ہیں۔

مذہبی جماعتوں کا اصل کردار اصل شناخت ان کی قیادت کی اخلاقی، ایمانی، روحانی حیثیت ہے ہمیں ایسے کردار پیش کرنے چاہئیں جن کی روحانیت سے ہر شخص متاثر ہو اس کے لیے کسی منصوبہ بندی، فنڈ، ادارے، کی ضرورت نہیں خیر القرون کا معاشرہ تاریخ اسلامی کا عظیم ترین معاشرہ اس لیے ہے کہ اس میں کوئی کتاب طبع شدہ موجود نہ تھی نہ صحابہ کرام نے کوئی

کتاب لکھی نہ کوئی عالی شان عمارت والا ادارہ تھا انھوں نے انسان تیار کیے انسان تیار کرنا سب سے آسان کام ہے اور سب سے مشکل بھی۔

ایک فرد بڑا عالم باعمل چند طلباء کو اپنے خاص حلقۂ درس، تربیت میں لے لے انھیں امام ابوحنیفہ، امام ابو حنبلؒ اور امام غزالی جیسا بنادے اس کام کے لیے کسی سرمایہ، مال، ادارے، عمارت کی ضرورت نہیں صرف صاحبِ کردار عالم کی ضرورت ہے جو کام سب سے آسان ہے ہم اسے سب سے مشکل سمجھتے ہیں کوئی جماعت اس طرف متوجہ نہیں اگر ہماری صفوں میں امام ابوحنیفہؒ، امام غزالیؒ، احمد بن حنبلؒ، مجدد الف ثانیؒ، جیسے صرف ایک دو عظیم لوگ پیدا ہوجائیں تو اس امت کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ مگر ہمارا سارا زور Whats App,SMS پروپیگنڈے، جلوس، فیس بک اور نیٹ پر ہے اور اس ذریعے سے کردار سازی کا کام تو بالکل ممکن ہی نہیں ہے۔

جماعت اسلامی اس وقت ایم ایم اے کا حصہ ہے اس کا اخبار جسارت اداریے میں لکھتا ہے:

افسوسناک امر یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ۷۰ برس کے دوران کبھی دینی جماعتوں، دینی و مذہبی رجحان رکھنے والوں کو اقتدار تک نہیں پہنچنے دیا گیا بلکہ اب تو حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہر طرف سے ان ہی کے خلاف رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ جس خلائی مخلوق کا ذکر میاں نواز شریف نے کیا اس خلائی مخلوق نے انھیں اقتدار تک پہنچایا اس لیے کہ ان کی پارٹی سے مسلم کے نام کا جھانسہ عوام کو دیا جاسکے۔ بہرحال اس ملک کے عوام تو اسلامی حکمرانی چاہتے ہیں۔ اس خلائی مخلوق نے ذوالفقار علی بھٹو کو حکمران بنایا اور ان کو اسلامی سوشلزم کا نعرہ دیا گیا۔ اسی خلائی مخلوق نے کبھی زرداری کبھی شوکت عزیز کبھی شجاعت اور کبھی جمالی کو اقتدار میں پہنچایا۔ اگر ضرورت پڑتی ہے تو یہ خلائی مخلوق خود بھی اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور آج یہی خلائی مخلوق انتخابی مہم، مستقبل کی نقشہ گری اور اسمبلی کی سیٹوں کی تقسیم تک میں مصروف ہے۔ ممکنہ وزرائے اعظم کی لائن لگوادی گئی ہے، کئی کئی لوگوں کو لارے لپے دیے گئے ہیں لیکن جن لوگوں کو آگے لایا جارہا ہے، جن پر سرمایہ کاری کی جارہی ہے وہ فاروق اعظمؓ کی گرد بھی ہوسکتے ہیں؟ پھر کیکر کے پودے سے گلاب کی فصل کیوں کر ممکن ہوگی؟ فاروق اعظمؓ جیسی حکمرانی کرنے والے سیکولر پارٹیوں یا لسانی وعلاقائی تنظیموں سے پیدا نہیں ہوتے۔ ہاں ان میں بھی

ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو ایمان کے پختہ اور عمل کے پکّے ہوں لیکن کسی میڈیائی لہر کی وجہ سے بہہ گئے ہوں، مگر بحیثیت جماعت ان سے ایسا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یہ نادر پھل دینی جماعتوں کے پاس سے ملے گا۔ خواہ وہ جماعت اسلامی ہو، جمعیت علمائے اسلام کا کوئی دھڑا ہو۔ جے یو پی کا کوئی گروپ یا اہل حدیث، شیعہ، بریلوی، سنی تحریک، جماعت الدعوۃ یا آج کل کی معروف دعوت اسلامی وغیرہ ہیں فاروق اعظم جیسے حکمران ایسی ہی جماعتوں سے ملیں گے''۔[جسارت ۲۵/جولائی ۲۰۱۸ء]

سوال: سراج الحق نے کہا ہے کہ الیکشن سے پہلے ہی نتائج کا اندازہ ہو گیا تھا ہمیں الیکشن سے پہلے متحد ہونا چاہیے تھا [جسارت ۲۸/جولائی ۲۰۱۸ء صفحہ ۱۱] یہ خبر ہم نے جسارت میں پڑھی ہے؟ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: اگر جماعت اسلامی کو سب کچھ معلوم تھا تو آپ نے کوئی حکمت عملی طے کیوں نہ کی ۲۰۰۸ء کی طرح انتخابات کا بائیکاٹ ہی کر دیتے جب بائیکاٹ کا وقت ہوتا ہے اس وقت آپ الیکشن میں حصہ لیتے ہیں جب بائیکاٹ کی ضرورت نہیں ہوتی آپ بائیکاٹ کر دیتے ہیں سیاسی میدان کے کھیل کھیلنے کے جو طریقے ہیں آپ نے ان پر بھی توجہ نہیں دی جمہوری سیاست میں مذہبی اقدار تو نہیں چل سکتیں یہ دینی جماعتوں کی سیاسی جدوجہد سے واضح ہے مگر یہ جماعتیں سیاسی حربے بھی صحیح طریقے سے استعمال نہیں کر سکتیں۔ کب کون سا مطالبہ کرنا چاہیے ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں فیض آباد دھرنے کے موقع پر جنرل باجوہ نے خادم حسین رضوی صاحب کو کہلوایا کہ کیا مانگتے ہو بتاؤ جو کہو گے وہ ملے گا یہ بات خادم صاحب نے خود بتائی مگر حضرت والا نے کیا مانگا قادیانی اسمبلی میں نہیں جائے گا، وزیر قانون مستعفی ہوں اور ختم نبوت، توہین رسالت کے قانون کی حفاظت کی جائے حضرت والا صرف یہ مطالبہ کرتے کہ آئین میں حاکمیت اعلیٰ خدا کی ہے یہ نظری فکری طور پر ہے حاکمیت اللہ کی ایجنسی کا آئین میں ذکر نہیں وہ علماء ہیں آپ آئین میں یہ ترمیم کرا دیں کہ شریعت اسلامی صرف علماء کے ذریعے نافذ ہوگی پارلیمنٹ کے ذریعے نہیں احکامات شریعت پارلیمان کے ذریعے قانون نہیں بنیں گے براہ راست نافذ ہوں گے۔ آپ نے تو وہ قیمتی وقت بھی کھو دیا اب یہ موقع دوبارہ نہیں آئے گا لبرل تو کہہ رہے ہیں کہ فوج نے دھرنے کے معاہدے میں باجوہ صاحب کا نام ضمانتی کے طور پر لکھ

کر عشق رسالت کے مسئلے سے علماء کی اجارہ داری ختم کر کے اسے قومیالیا اب علماء اس مسئلے پر بھی عوام کو متحرک نہیں کر سکتے وہ وقت گزر گیا۔

سوال: جسارت سنڈے میگزین میں سلمان علی صاحب نے لکھا ہے عسکریت نے اکثریت کو پیچھے چھوڑ دیا انھوں نے ISPR کے جنرل آصف غفور کی ٹوئٹ نقل کی جو انتخابی نتائج پر ان کا قرآنی تبصرہ ہے قرآن کی آیت کہ اللہ جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے ISPR کا مؤقف قرآنی آیت کی روشنی میں یہ ہے کہ تحریک انصاف کو اللہ نے عزت دی اور دیگر تمام سیاسی سیکولر اور مذہبی جماعتوں کو ذلیل کر دیا تو ISPR کیا کر سکتا ہے۔ سلمان علی نے شمع جونیجو کی ویڈیو کا ذکر کیا ہے کہ فوجی ٹھپے لگا رہے ہیں یہ بھی لکھا ہے کہ رپورٹروں نے بتایا کہ ہمیں نتائج الیکشن کمشنر سے نہیں تحریک انصاف کی جانب سے موصول ہو رہے ہیں اور وہ ہم نشر کر رہے ہیں [جسارت سنڈے میگزین ۲۹ر جولائی ۲۰۱۸ء] ان باتوں میں کتنی حقیقت ہے؟

جواب: یہ ایم ایم اے اور ISPR کا ذاتی معاملہ ہے ہم اس میں مداخلت نہیں کر سکتے کس نے عزت پائی کون ذلیل ہوا یہ اللہ جانتا ہے ISPR نہیں۔

ہم تو ایرانی علماء کی طرح ستر سال تک جدوجہد کے لیے بھی آمادہ نہیں ہم چاہتے ہیں کہ بس اقتدار ہمیں مل جائے ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے حالاں کہ اگر اسلامی جماعتوں کو اقتدار دے دیا جائے تو یہ کچھ بھی نہیں کر سکتیں ان کے پاس کوئی تیاری، کوئی متبادل، کوئی لائحہ عمل موجود ہی نہیں ہے۔ پروفیسر خورشید صاحب سے Tempa یونیورسٹی میں اسلامی شریعت کے پندرہ رکنی مغربی ماہرین نے مکالمے میں پوچھا کہ اگر آپ کو اقتدار دے دیا جائے تو آپ قرضے کے بغیر حکومت کیسے چلائیں گے؟ تو خورشید صاحب کو کہنا پڑا کہ قرضہ تو لینا ہوگا ظاہر ہے دنیا میں ترقی کا کوئی ماڈل قرض کے بغیر موجود ہی نہیں ہے قرضہ، ترقی، آلودگی، تباہی و بربادی سب لازم و ملزوم ہیں لیکن ہم سب ترقی چاہتے ہیں کوئی ایک اسلامی جماعت بتایئے جو ترقی کے عقیدے کا انکار کرتی ہو؟ تو قرضہ لیا جائے گا وہ سود پر ہی ملے گا تو اسلامی انقلاب کون سا؟ سود لینے اور دینے والے کی بخشش ہی نہیں ہے۔ جصاص کی احکام القرآن اور امام سرخسی کی المبسوط میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ سود ہر معاہدے سے مستثنیٰ ہے رسالت مآبؐ نے اہلِ نجران سے

کہا تھا کہ سود کا لین دین کیا تو معاہدہ ختم ہوجائے گا۔سود کی اتنی شناعت،اتنی مخالفت مگر آپ کی اسلامی ریاست سود کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی اور ترقی کو ایک قدر بتاتی ہے پھر اس کے لیے دنیا بھر سے قرضے مانگتی ہے تو یہ کیا تماشہ ہے؟

سوال: ایک جانب جماعت اسلامی ، ایم ایم اے کہہ رہی ہے کہ انتخابات میں زبردست دھاندلی ہوئی ہے لیکن ۲۶؍جولائی کے جسارت میں جماعت اسلامی کے ترجمان امیر العظیم صاحب نے تحریک انصاف اور عمران خان کو کامیابی پر بھرپور مبارک باد دی ہے اور اپنے تعاون کا یقین دلایا ہے یہ کیا تضاد ہے [جسارت ۲۹؍جولائی کے سنڈے میگزین میں مولانا طاہر مدنی کا مضمون شائع ہوا ہے پاکستانی الیکشن کے نتائج دینی جماعتوں کی کارکردگی وہ لکھتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ الیکشن میں کامیابی انہی کو ملے گی جن کے لیے رائے عامہ ہموار ہوگی اور جو اکثریت کی پسند ہوں گے اگر اکثریت لبرل ہے تو ایسی ہی طاقتیں کامیابی حاصل کریں گی ہمارا کام کوشش کرنا ہے چاہے ہمیں ایک سیٹ نہ ملے الیکشن کا موقع دعوت پہنچانے کا ہوتا ہے اپنی بات ہم عوام تک پہنچا سکتے ہیں [جسارت سنڈے میگزین ص ۷ ۲۹؍جولائی ۲۰۱۸ء]

سوال: کراچی میں ایم ایم اے کے عظیم الشان جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے دھاندلی کے خطرے کی بھی نشان دہی کی تھی جسارت کے مطابق جلسے میں ایک اہم بات کا مقررین نے مختلف الفاظ میں اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر ایم ایم اے کے مینڈیٹ کو چوری کیا گیا تو پھر دما دم مست قلندر ہوگا۔مولانا فضل الرحمان صاحب نے کہا ماضی میں ملک پر مسلط رہنے والے عوام کو کچھ نہیں دے سکے۔انھوں نے کہا کہ آج ملک کے اندر عوام کی جان اور مال محفوظ نہیں ہے، جو ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ۷۰ برسوں میں جو عوام کو حقوق اور تحفظ نہیں دے سکا، اب اس طبقے اور ٹولے کو اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔آج عوام کی عدالت لگی ہوئی ہے اور عوام اپنی عدالت میں ان حکمرانوں اور ٹولے کو دوبارہ مسلط نہ ہونے دینے کا فیصلہ دیں حکمران ملک کے دریاؤں اور زراعت کا تحفظ نہیں کرسکے۔انھوں نے کہا کہ پارلیمنٹ کے اندر ایک جماعت نے مذہب اور سیاست کو الگ کرنے کی بات کی، ہم نے اس کا مقابلہ کیا ۔ایک جماعت نے قرار دادِ مقاصد کو آئین سے نکالنے کا کہا، ہم نے اس کی مخالفت کی ۔[فرائیڈے اسپیشل ۲۰ جون ۲۰۱۸ء] میرا سوال یہ ہے کہ دھاندلی کا امکان تھا تو دما دم

مست قلندر کیوں نہیں کیا گیا مولانا فضل الرحمان نے تمام سابق حکمران ٹولے کو تمام برائیوں کا ذمہ دار قرار دیا مگر مولانا صاحب ۲۰۰۲ء سے ۲۰۱۸ء تک اسی حکمران ٹولے کے ساتھ اقتدار میں شریک رہے ہیں تو کیا وہ ذمہ داری سے بری ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ سابق ٹولے کو مسلّط نہیں ہونے دیں گے ان کے ساتھ خود رہے اب APC میں اس ٹولے کو پھر لے آئے ہیں۔ یہ قول و فعل کا تضاد ہے یا حکمت عملی کا کھیل ہے؟

جواب: یہ سوالات ایم ایم اے کی قیادت سے پوچھئے ہمارا سوال تو صرف یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی زبان استعمال کرنا کیا مذہبی لوگوں کو زیب دیتا ہے اب دمادم مست قلندر ہو گا یہ تو بھٹو صاحب کی زبان تھی آج بھی زندہ ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ جب مینڈیٹ چوری ہونے کا اندیشہ تھا تو اس کی کیا پیش بندی کی گئی احتجاجی تحریک کہاں رہ گئی دمادم کیوں نہیں ہوا کہاں رہ گیا مجمع کو گرمانے کے سوا مذہبی سیاست کا کوئی اور کام نہیں ہے ۱۹۷۷ء جتنی مزاحمت بھی کیوں نہ ہوسکی فوراً مصالحت، مفاہمت اور جمہوریت و پارلیمنٹ کیوں یاد آ گئے اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں میں دم خم نہیں ہے کارکن کسی تحریک کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور رہنما مصلحت و مصالحت کو ہر شے پر مقدم سمجھتے ہیں پھر معرکہ حق و باطل کہاں رہ گیا؟ جس کا اختتام باطل سے موالات تعاون اور اتحاد کی صورت میں سامنے آ گیا۔

۲۰۰۲ء سے ۲۰۱۸ء تک حکمرانوں کے ساتھ اقتدار میں بیٹھنے کے بارے میں ایک سوال کراچی میں مولانا فضل الرحمان سے کسی خاتون نے پوچھا کہ آپ اسلام کی بات کرتے ہیں مگر ہمیشہ سیکولر لوگوں کے ساتھ کیوں بیٹھتے ہیں تو ان کا جواب تھا کہ میں چھے آٹھ آدمیوں کے ساتھ حزب اختلاف میں بیٹھ کر کچھ نہیں کر سکتا لہٰذا اقتدار میں شریک ہو کر مدارس دینیہ کے تحفظ کا فریضہ ادا کرتا ہوں یہ ہماری مجبوری ہے شوق نہیں ہے حکمت عملی ہے آپ کا سوال بہت اچھا ہے لیکن حقیقت بڑی تلخ ہے۔ ممکن ہے اس جواب سے آپ کی تشفّی نہ ہو لیکن جب مولانا نے کراچی یونیورسٹی میں یہ جواب دیا تو بھرپور تالیوں سے اس جواب کی تحسین کی گئی ویسے بھی مولانا گفتگو میں کمال رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی ملکہ دیا ہے کبھی غصے میں نہیں آتے نہایت تحمل کے ساتھ سخت ترین سوال کا جواب ضرور دیتے ہیں خواہ جواب موضوع سے متعلق نہ ہو۔ ویسے بھی سیاست دانوں کی تقاریر کو خطابت کے سحر کے تناظر میں لینا چاہیے عوام کو متوجہ

کرنا، متاثر کرنا، راغب کرنا، متحرک کرنا یہ خطابت کا بنیادی کام ہے یہ کاشف حقائق کم کاشف جذبات زیادہ ہوتی ہے۔

سوال: آپ نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ قومی ریاست میں مذہبی جماعتوں کی صرف تین حیثیتیں ہوتی ہیں سیکولرائزنگ ایجنٹ، پریشر گروپ، قومی ریاست کے دِفاع کے بلا معاوضہ وکیل ۲۰۱۸ء کے انتخابات کے حوالے سے جو رپورٹیں آئی ہیں اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں مثلاً جنگ کے مطابق تحریک لبیک کی وجہ سے مسلم لیگ کو تیرہ اور تحریک انصاف کو چھے نشستوں سے محروم ہونا پڑا اور تحریک نے پانچویں بڑی پارٹی کی حیثیت سے ۲۵ لاکھ ووٹ حاصل کیے لیکن اسمبلی میں نمائندگی برائے نام بھی نہیں ہے تو کیا دنیا بھر میں مذہبی جماعتوں کے نتائج اس قسم کے ہوئے ہیں؟

جواب: دنیا بھر کی مذہبی جماعتوں کے اعداد و شمار سر دست میسر نہیں ہیں جیسے ہی ہم یہ اعداد و شمار اِکٹھے کر لیں گے آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے پاکستان میں مذہبی جماعتوں کی سیاست اور ان کے نتائج کے اعداد و شمار ڈاکٹر ولی رضا نصر کی کتاب میں موجود ہیں ان کی دو کتابیں پڑھ لیجیے۔

(1) The Vanguard of the Islamic Revolution: The Jamaat Islami Pakistan

(2) Mawdudi & The Making of Islamic Revivalism

علماء اسلامی جماعتیں اسلامی تحریکیں ان سے منسلک ان کی ذیلی تنظیمیں شعوری غیر شعوری طور پر سیکولرائزیشن لبرلائزیشن کا ہی کام کر رہی ہیں یہ ہم نہیں کہہ رہے تحقیقات بتا رہی ہیں خود جماعت اسلامی کے ادارے اسلامک ریسرچ اکیڈمی کے جنرل ''تحصیل'' میں امینہ جمال کی تحقیق

(1) Jamaat-e-Islami Women in Pakistan : Vanguard of a New Modernity?

پر شائع شدہ تبصرہ پڑھ لیجیے یہ تبصرہ جماعت اسلامی نے شائع کیا ہے ہمارا نہیں ہے [] مصنفہ کی تحقیق ہے کہ جماعت اسلامی کی خواتین اسلامی معاشرے کو جدیدیت (ماڈرن ازم) سے ہم آہنگ کرنے کا کام اسلامی منہاج میں کر رہی ہے کتاب کی مصنفہ امینہ جمال مولانا

جمال میاں فرنگی کی صاحبزادی ہیں جو ایک بڑے پیر اور تحریکِ پاکستان کے اہم رہنما تھے۔ اس تحقیق میں جماعت اسلامی خواتین کی حکمتِ عملی، مولانا مودودی کے اصولوں سے اس کے اختلافات، اور ایک معتدل اسلام کی طرف پیش رفت جو جدیدیت کا راستہ دِکھاتا ہے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

امریکا سے ایک خاتون حمیرا اقتدار نے بھی جماعت الدعوۃ خواتین اور جماعت اسلامی خواتین پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ دونوں دینی جماعتیں نہایت اخلاص، للٰہیت کے باوجود غیر شعوری طور پر ماڈرن ازم کی وسعت اور پھیلاؤ کا سبب بن رہی ہیں دونوں جماعتیں خواتین میں مذہبی علمیت، عصبیت پیدا کرتی ہیں لیکن ان کا طریقہ کار ایسا ہے کہ یہ مذہبی علمیت جدیدیت کے ساتھ افہام و تفہیم کا راستہ نکال دیتی ہیں۔

Secularizing Islamists : Pakistani Jamaat Islams & Woman J. Dawa in urban Pakistan

یہ معاملہ صرف اسلامی جماعتوں کا نہیں تہذیبوں کا بھی ہے ہندوستان میں جامعہ عثمانیہ کو شبلی، حالی، حمید الدین فراہی، سید سلیمان ندوی اور بہت سے مسلم مفکرین نے ایک عظیم اسلامی درس گاہ کے طور پر دیکھا جہاں اردو ذریعہ تعلیم تھا بہت سے محققین نے اردو اور جامعہ عثمانیہ کو ایک مذہبی انقلاب کا پیش خیمہ سمجھا لیکن حیدرآباد، دایم ایم اے کن، اردو اور جامعہ عثمانیہ کے ذریعے مغرب کے بالواسطہ اختیار و اقتدار کو ہی مستحکم کیا گیا اور اردو زبان نے سیکولرائزیشن کے عمل میں کلیدی کردار ادا کیا اس موضوع پر ایک بھارتی خاتون سرسوتی دتلا کے دو مطالعات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

(1)The Language of Secular Islam: Urdu Nationalism & Colonial India.

(2) The Origions of indirect Rule in India : Hydrabad & The British Imperial Order.

سوال: ایم ایم اے اور مذہبی جماعتوں کی جانب سے کہا جارہا ہے کہ یہ انتخابات اسلام اور کفر کی جنگ ہے امریکا کے حامیوں اور مخالفوں کا معرکہ ہے ووٹ شہادت ہے تو اس طرح ووٹ کی پرچی کو ایک عقیدہ بنادیا گیا ہے کیا عقائد کی فہرست میں ووٹ کی پرچی کا اضافہ

بدعت نہیں؟

جواب: یہ سوال آپ دارالافتاء کو ارسال کیجیے مفتی صاحب ہی اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہیں مسئلہ یہ ہے کہ جمہوریت جدید ریاست کے نہایت بھیانک چہرے کو چھپانے کا ایک بہترین طریقہ (Process) ہے یہ سیاسی چہرے یعنی حکمران بدلنے کا ایک نظام ہے تاکہ اصل نظام زر، آزادی، ترقی، مساوات قائم رہے نظام مستقل ہے چہرے غیر مستقل Post بدلتی رہتی ہے Authority نہیں بدلتی جو غیر منتخب نمائندوں کے پاس ہے۔ اس پروسس کے لیے فتویٰ دیا جانا چاہیے یا نہیں یہ علماء ہی طے کر سکتے ہیں فتویٰ پہلے ریاست پر آنا چاہیے اس کے بعد ریاست کے ایک طریقہ کار پر ہم پہلے سوال کا جواب نہیں دے رہے دوسرے سوال کا جواب دے رہے ہیں پروسس میں بے شمار مسائل، بے شمار سوالات اور بے شمار الجھنیں، پیچیدگیاں آتی ہیں لہٰذا ہر مسئلے پر مفتی کو رائے دینی ہوگی لہٰذا فتویٰ اتنا طویل ہو جائے گا کہ عام آدمی کے فہم سے بالا رہے گا عام آدمی خود مسئلہ حل نہیں کر سکے گا اس کے باوجود بہت سے سوالات جو انتخابی عمل جمہوری پروسس کے درمیان حالات کے باعث پیدا ہوں گے ان کا جواب اس موقع پر کون دے گا لہٰذا علماء کو غور کرنا چاہیے کہ پروسس کے بارے میں وہ کوئی حتمی فتویٰ دے سکتے ہیں یا نہیں یا اس مسئلے کو عوام کی صواب دید پر ہی چھوڑ دیا جائے یعنی فرد کا نفس ہی مجتہد عصر ہو جائے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ دینی جماعتوں کے لیے 'پاکستان' اور 'جمہوریت' دو ایسے خدا ہیں جس کے سامنے شریعت اور دینی امور میں حالت اضطرار اور زمینی حقائق کے پیش نظر مصلحت و مصالحت کا عنصر خود بخود دَر آتا ہے۔

'جمہوریت' اتنا مقدس مذہب ہے، جمہوری اقدار اتنی عظیم ہیں، جمہوری عمل کے تقدس کی اتنی قدر و قیمت ہے کہ اس جمہوریت کی بحالی کے لیے، جمہوریت کے استحکام کے لیے پاکستان کے دشمن، کرپٹ، بدعنوان، انڈیا کے حامی، امریکا کے ایجنٹ، عالمی استعماری طاقت کے غلام نواز شریف کی مسلم لیگ سے بھی اتحاد کیا جا سکتا ہے اور لبرل سیکولر پاکستان دشمن پیپلز پارٹی سے بھی اتحاد کیا جا سکتا ہے۔ اصل خیر اسلام، نظریہ پاکستان نہیں جمہوریت ہے۔ جمہوریت اگر رہے گی تو اسلام آجائے گا۔ جمہوریت مستحکم ہوگی تو نظریہ پاکستان بچ جائے گا۔

جمہوری عمل جاری وساری رہے گا تو اسلامی حاکمیت وخلافت اسی کے ذریعے قائم ہوجائے گی۔ لہٰذا جمہوریت کے تحفظ کے لیے دین کے دشمنوں، پاکستان کے مخالفوں، امریکی ایجنٹوں، بدعنوانوں، کرپشن میں ملوث ہر چور یا ڈاکو لٹیرے سے اتحاد کیا جاسکتا ہے۔اصل چیز جمہوریت ہے جمہوری نظام ہے اس کے بغیر نہ اسلام آسکتا ہے نہ شریعت نافذ ہوسکتی ہے، نہ دین کا غلبہ ہوسکتا ہے، نہ مذہبی اقدار، مدارس، مساجد، خانقاہوں کا تحفظ ہوسکتا ہے۔جمہوریت ہی امرت دھارا ہے۔ ہر مرض کا علاج ہر بیماری کی شفا ہر مسئلے کا حل ہر مصیبت کی دوا ہر مشکل کی دعا ہر خرابی کی درستگی کا طریقہ جمہوریت ہے اور جمہوریت شریعت پر بھی بالادست ہے۔ جمہوریت ہوگی تو آئینی حکومت ہوگی۔آئین پاکستان صحیح طریقے سے نافذ ہوگا تو شریعت خودبخود آجائے گی۔بس اسی جذبے کے تحت ایم ایم اے اور تمام مذہبی جماعتیں کبھی تحریک انصاف سے اتحاد کرتی ہیں، کبھی مسلم لیگ، پی پی پی، این اے پی، ایم کیو ایم سے اتحاد قائم کرتی ہیں۔جمہوریت وہ طوطا ہے جو اگر مرگیا تو دنیا تاریک ہوجائے گی۔ ہر طرف اندھیرا ہوگا۔امید کی کوئی کرن نہیں ہوگی۔لہٰذا جمہوریت کو بچانے اس کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے علماء نے نہایت جرات سے کام لیتے ہوئے فوج پر پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار یہ الزام عائد کیا ہے کہ اس نے انتخابات میں دھاندلی کی ہے۔لیکن اس الزام کے بہت سے ٹھوس ثبوت وہ ابھی تک پیش نہیں کرسکے۔لیکن یہ بات تو طے ہے کہ الیکشن میں بہت کچھ ہوا ہے اور اس طرح ہوا ہے کہ ایم ایم اے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا وہ بس سوچ رہے ہیں کہ کیا ہوا؟ سرا کہاں سے پکڑیں۔

سوال: آپ نے اپنے مضمون ''کیا ایم ایم اے الیکشن میں حصہ نہ لے''۔ایک عالم دین کے سوال میں شاہ نواز فاروقی صاحب کا حوالہ دیا تھا۔فاروقی صاحب نے لکھا تھا کہ میاں نواز شریف عالمی اسٹیبلشمنٹ کا مہرہ ہیں اور وہ میاں صاحب کے ذریعے مقامی اسٹیبلشمنٹ کی قوت توڑنا چاہتی ہے۔خلائی مخلوق نے ہمیشہ سیاست کو کنٹرول کیا۔ ورنہ میاں صاحب کی سیاسی پیدائش ممکن نہ تھی۔ میاں صاحب جنرل کیانی کی مدد سے کامیاب ہوئے۔ وکلاء جو مشرف کے خلاف تھے، کیانی صاحب کی حمایت سے تحریک چل رہی تھی۔ (فرائیڈے اسپیشل ۱۳ جولائی ۲۰۱۸ء) تو کیا یہ تجزیہ درست نہیں ہے؟

جواب: اگر خلائی مخلوق یعنی فوج سیاست کو ہمیشہ سے کنٹرول کررہی ہے تو شاہ نواز فاروقی صاحب کی جماعت اسلامی ان کنٹرولڈ انتخابات میں کیوں حصہ لے رہی ہے؟ وہ ان سے الگ ہوجائے اور دوسرے راستے اختیار کرے۔ کیوں کہ فوج سے لڑنا جماعت اسلامی کے لیے ممکن نہیں۔ یہی جماعت کی پرامن پالیسی ہے اور فی الحال ٹھیک ہے اگر عدلیہ فوج کی حمایت سے بحال ہوئی تو آج جو فیصلے عدلیہ کررہی ہے وہ فوج کی مرضی سے ہورہے ہیں یا اس کی آزادانہ مرضی سے مسلم لیگ چور ہے بالکل ٹھیک لیکن آصف زرداری تو ہر مقدمے سے بری ہوگئے Mr. Clean یہ کیا ہے؟

دنیا میں جدید انقلابات فوج کے بغیر یا فوج کی حمایت کے بغیر نہیں آسکتے چین روس امریکہ کا انقلاب یا تو فوج نے برپا کیا یا فوج سے لڑکر کامیابی حاصل کی گئی۔

جدید انقلاب کا طریقہ یہی ہے کہ فوج آپ کی حامی ہوجائے آپ کی پشت پر کھڑی ہو جس طرح انقلاب امریکہ میں ہوا یا آپ فوج کو شکست دے دیں جس طرح روس چین ایران میں ہوا انقلاب پر جتنی کتابیں ہیں وہ پڑھ لیجیے۔

ہم جدید انقلاب کی تاریخ بیان کررہے ہیں آپ کو پاکستانی فوج سے لڑنے کی دعوت نہیں دے رہے منطق استقرائی بڑے مسئلے پیدا کرتی ہے فوراً لوگ استقراء سے نتائج نکالنے لگتے ہیں اس کا یہ مطلب اس کا وہ مطلب۔

انقلاب کی اصطلاح مغرب کی اصطلاح ہے ہماری تاریخ میں انقلاب کی نہیں دعوت کی اصطلاح ہے دعوت نفرت کی بنیاد پر نہیں ابن آدم سے محبت کی بنیاد پر دی جاتی ہے کہ آدم کی نسل کا ہر فرد جنت کا مستحق بن جائے دعوت کے مراحل ہوتے ہیں ان مراحل کی تاریخ قرآن اور سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے دعوت کا نقطۂ عروج سورہ توبہ ہے جس پر عمل صبح قیامت تک کیا جائے گا۔ لہٰذا جہاد بھی قیامت تک جاری رہے گا انقلاب تو خون خرابہ ہے۔ روس، چین، فرانس، امریکا سب انقلاب خونی انقلابات ہیں۔ اسلام کی دعوت فتح مکہ کے بعد بھی جاری رہی رسالت مآبؐ نے فرمایا تھا لاتثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔ جب حضرت بلالؓ کعبہ کی چھت پر اذان دے رہے تھے تو عتاب بن اسید نے کہا تھا خدا کے گھر پر ایک کالا گدھا چڑھ کررہے گا کاش یہ نہ ہوتا شکر ہے کہ میرا باپ زندہ نہیں ہے وہ یہ کبھی برداشت نہ کرتا لیکن

معافی کے اعلان کے بعد انہی عتاب نے اسلام قبول کیا اور رسالت مآبؐ نے ان کو اسی وقت مکہ کا گورنر مقرر کردیا۔ دعوت کی تاریخ یہی ہے جہاد بھی توسیع دعوت کی صورت ہے جہاد کا مقصد قلوب انسانی کی فتح ہے زیادہ سے زیادہ لوگ جنت کے حق دار بنیں انقلاب روس، چین ہوتا تو مکہ میں تمام اہلِ مکہ ہلاک ہوجاتے ان کے مسلمانوں پر کتنے مظالم تھے۔

بنیادی بات صرف یہ ہے کہ مذہبی جماعتیں اپنی اقدار، روایات، کردار پر توجہ دیں ان کا حال تو یہ ہے کہ اگر الیکشن میں ان کو کامیابی ملتی ہے تو یہ دیگر سیاسی لبرل جماعتوں کی طرح جلوس، جلسے، جشن مناتی ہے۔ رسالت مآبؐ نے جب مکہ فتح کیا جو اپنی نوعیت کا مثالی معرکہ تھا جس میں کوئی زخمی یا قتل نہیں ہوا بس آپ تشریف لے گئے اور مکہ فتح ہوگیا تو فتح کے بعد نہ جلوس، نہ جلسہ، نہ تقریر نہ بیان بازی، نہ ناچ گانا، نہ آتش بازی، نہ ہوائی فائرنگ ابوسفیان کی بیوی ہندہ کا بیان ہے احادیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس نے رات کو اپنے گھر کی چھت سے کعبہ کا منظر دیکھا تو صحابہ کرامؓ سجدے میں گرے ہوئے تھے نماز، تلاوت، الحاح و زاری، ذکرواذکار ہورہا تھا وہ یہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی اِسلامی فتح یہ ہوتی ہے فتح احساس ذمہ داری آخرت کی جواب طلبی کا شعور پیدا کرتی ہے ہمارے یہاں تو اقتدار کو خوشی کا معاملہ سمجھا جاتا ہے صحابہؓ اور ہم میں فرق ہے یہ بہت بڑا فرق ہے لہٰذا اختیار و اقتدار ہمارے لیے رحمت کے بجائے زحمت بن جاتا ہے لیکن شاہ نواز صاحب سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر فوج سیاست کو ہمیشہ سے کنٹرول کررہی ہے اور فوج نے 2018ء کے الیکشن کو بھی کنٹرول کرلیا تو آپ اس پر احتجاج کیوں کررہے ہیں؟ جب پہلے سے آپ کو حقیقتِ سیاست کا علم ہے اور ستر سال سے اگر ایسا ہی ہورہا ہے جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے تو جماعت اسلامی ایم ایم اے کے ذریعے فوج کے خلاف احتجاجی تحریک کیوں چلارہی ہے جو نا معلوم ہے وہ معلوم ہے کہ نعرے کیوں لگوارہی ہے خلائی مخلوق کی پھبتی کیوں کس رہی ہے اپنی تقدیر پر راضی ہوجائیں اس عمل کا کیا فائدہ ہے۔ یہ گفتگو ہم شاہ نواز صاحب کے اصولوں کے تناظر میں کررہے ہیں۔ ہمارا موقف دوسرا ہے جو ہم آگے بیان کریں گے۔

شاہ نواز صاحب کہتے ہیں کہ نواز شریف عالمی اسٹبلشمنٹ کے مہرے ہیں اور مقامی اسٹبلشمنٹ کو شکست دینا چاہتے ہیں تو ایم ایم اے کی تحریک کس کے خلاف ہے؟ مولانا فضل

الرحمن اور ایم ایم اے فوج کو ہی مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں تو اس تحریک کے نتیجے میں کس کو شکست ہوگی؟ اس کا جواب شاہ نواز صاحب کے ذمے ہے۔ شاہ نواز صاحب کے سیاسی کالموں کے نتائج اکثر متضاد (Oxymoron) ہوتے ہیں۔

سوال: جماعت نے عموماً فوج کا ساتھ دیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں وہ فوج کے ساتھ رہے۔ جماعت کے نائب امیر خرم مراد اس کے سخت خلاف تھے۔ اس کی سزا جماعت اسلامی آج تک بھگت رہی ہے تو کیا اب جماعت اسلامی نیا تجربہ کر رہی ہے فوج کی مخالفت کا تجربہ۔

جواب: یہ سوال جماعت کی اسلامی قیادت سے کیجیے۔ انھوں نے فوج کی حمایت کیوں کی؟ وہ مشرقی پاکستان میں ڈاکٹر مالک کی فوجی کابینہ میں اور ضیاء الحق کی فوجی کابینہ میں کیوں شامل ہوئے؟ افغان جنگ میں وہ پاکستان کی فوج کے شانہ بشانہ رہے۔ کشمیر کے معاملے میں بھی ان کا یہی طرز عمل ہے تو بحیثیت جماعت وہ جو فیصلے کرتے ہیں اس کا تعقل ان سے معلوم کیجیے۔ ان کی پالیساں بہت سے حقائق کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ وہ حقائق وہی جانتے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم؟

مولانا مودودی نے تو تصریحات میں ایک سوال کے جواب میں یہی کہا کہ تیسری دنیا کی فوجیں بہت مختلف فوجیں ہیں۔ ان کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے ہمیں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ روایتی تہذیبوں میں پیشہ ور فوج کا کوئی تصور نہیں تھا بادشاہ کی ایک خاص فوج ہوتی تھی باقی تمام رعایا سپاہی ہی ہوتی تھی فوج جدید ریاست کا جدید ادارہ ہے ورنہ روایتی تہذیبوں میں ہر شخص سپاہی، پوری امت سپاہی، ہر شخص جنگجو ہر ایک کے پاس اپنے ہتھیار عوامی فوج ہوتی تھی مدرسہ، خانقاہ، راویہ، دائروں کی تاریخ پڑھ لیجیے صوفیاء وہاں آنے والے نوجوانوں اور مقیم افراد کو دینی روحانی جسمانی عسکری تعلیم دیتے تھے نوکری پیشہ خاص فوج جدید ریاست کا ادارہ ہے۔ ظاہر ہے جماعت اسلامی مولانا مودودی کے اس ارشاد کی روشنی میں ہی تیسری دنیا کی پاکستانی فوج سے معاملات کر رہی ہوگی۔ اب تک اس کے تعلقات فوج سے مثبت اور بہتر ہی رہے ہیں۔ پہلی مرتبہ ہم اسے فوج کے بارے میں اس طرح تنقید کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ورنہ پاکستانی فوج خفیہ اداروں پر تنقید کا ٹھیکہ تو صرف اور صرف لبرل سیکولر قوم پرستوں نے اٹھایا ہوا ہے۔ وہی الزام دیتے ہیں کہ یہ ملٹری ملا اتحاد

ہے۔ مولوی فوج کے کسی اقدام کے خلاف کچھ نہیں بولتے۔ اس کی غیر مشروط حمایت کرتے ہیں۔ اس الزام یا دعوے میں کتنی صداقت ہے؟ یہ مذہبی جماعتیں ہی جان سکتی ہیں۔ وہی اس کا جواب دینے کی مجاز ہیں۔ لیکن اتنی بات تو ثابت ہے کہ وہ مذہبی جماعتیں جو پاکستان میں طالبان کی حامی تھیں وہ مفکر جو ان کے وکیل تھے زاہد مغل صاحب، حسن مدنی صاحب، جماعت اسلامی اور دیو بندی مکتب فکر انہوں نے طالبان کے خلاف فوجی آپریشن کے موقع پر حکومت سے یہ بھی نہیں کہا کہ اس آپریشن میں وہی اخلاقی اصول لاگو ہوں گے جو خوارج کے خلاف روا رکھے گئے تھے۔ آپریشن کے بعد زاہد مغل صاحب نے بھی حکومت کو متوجہ نہیں کیا طالبان کی حمایت میں بھی عاصمہ جہانگیر ہی آئی انہیں فوج سے اتنی نفرت تھی کہ وہ پشاور اسکول حملے کے مجرموں کے لیے سپریم کورٹ سے اسٹے آرڈر لے آئیں ایک مرتبہ ضمیر نیازی صاحب کے گھر پر ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی اور ہم نے فوج سے اس قدر عداوت کا سبب پوچھا تو انہوں نے جو کچھ بتایا وہ حیران کن اور نا قابل یقین تھا۔ اپنے حلقوں میں فرماتی تھیں پاکستان گیریژن اسٹیٹ ہے عائشہ صدیقہ اور چینی مفکر کی کتاب پڑھو جس نے گیریژن اسٹیٹ پر لکھا ہے۔

سوال: جس طرح شاہ نواز صاحب نے کہا کہ نواز شریف عالمی اسٹیبلشمنٹ کا مہرہ ہے۔ اس موضوع پر اوریا مقبول جان صاحب کا بہت مشہور قول ہے کہ پاکستانی لبرل سیکولر عالمی اسٹبلشمنٹ کا مہرہ بننے پر ہنسی خوشی تیار ہوجاتے ہیں تو پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا مہرہ بننے میں کیا حرج ہے؟ یہ بھی سنتے ہیں کہ مذہبی جماعتیں مقامی اسٹیبلشمنٹ کا مہرہ ہیں۔

جواب: ہم ان کے اس قول سے لاعلم ہیں۔ کسی صاحب عقل ذی علم کو کسی کا مہرہ نہیں بننا چاہئے۔ اسے 'الحق اور الخیر' کی پیروی کرنی چاہیے۔ مہرے بننے کا کام غیر مذہبی سیاسی مفادات کے تحت شروع ہوا ہے۔ پاکستانی فوج کو لبرل سیکولر سے یہ شکوہ نہیں ہے کہ وہ لبرل کیوں ہیں ان کا شکوہ یہ ہے کہ تم غیر ملکیوں سے بھارت امریکہ روس ایران سے تعلقات کیوں رکھتے ہو تم مذہبی جماعتوں کی طرح قوم پرست کیوں نہیں ہو وطن کے خلاف کیوں ہو فوج ان سے یہ نہیں کہہ رہی کہ تم مذہبی بن جاؤ وہ کہہ رہی ہے قوم پرست وطن پرست بنو اس کے لیے قربانی دو۔ ترکی اور ایرانی قوم پرستی دیکھو جہاں مذہبی سیکولر قوم کے معاملے میں ایک ہیں پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہ ابھی تک قومی ریاست نہیں بن سکا اور مسلم قوم پرستی کے بغیر پاکستانی قوم پرستی

کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی لبرل اسی مسلم تناظر کو پسند نہیں کرتے وہ فوج سے خالص لبرل قوم پرستی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

مذہبی جماعتیں کس کا مہرہ ہیں؟

ہمارے لوگوں کو اصولوں کی بنیاد پر سیاست کرنا چاہیے۔ اصولی سیاست میں ناکامی ہوسکتی ہے مگر نتیجہ پائیدار ہوسکتا ہے مگر جمہوری سیاست میں اصولی سیاست ممکن ہی نہیں۔ جمہوری سیاسی جماعت کا اصل مقصد اقتدار کا حصول ہے۔ جب ہدف مقصد منزل طے شدہ ہے تو اب یہی 'الحق' ہے۔ جب 'الحق' اقتدار کا حصول ہے تو اس کے حصول کے طریقے کا اخلاقی ہونا یا نہ ہونا ایک لایعنی بات ہے۔ لہٰذا ہم ۱۹۷۰ء سے لے کر آج تک دیکھ رہے ہیں کہ ہر مذہبی جماعت جمہوری سیاسی عمل میں شریک ہوکر اپنی نظریاتی شناخت، اپنی اخلاقی ساکھ، اپنی اقدار، روایات، اسلامی تہذیب وثقافت پر مسلسل مفاہمت مصالحت کرتی جارہی ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ یہ کیوں ہورہا ہے؟ یہاں شریعت پامال ہورہی ہے تو ان کا جواب ہوتا ہے آپ کی باتیں اچھی ہیں مگر یہ مثالی ہیں عملی نہیں یعنی Ideal ہیں Practicle نہیں ہے۔ عملی سیاست میں یہ کرنا پڑتا ہے آج ستر سال کے بعد ہمارا سوال مذہبی جماعتوں سے صرف یہ ہے کہ سیکولر لادینی سیاست کے تقاضوں کے مطابق آئیڈل ازم نہیں چل سکتا تھا۔ لہٰذا آپ نے پریکٹکل ازم اختیار کیا۔ کچھ سیکولر اور کچھ لبرل ہوئے۔ عورتوں کو کچھ آزادی دی۔ اپنی اقدار و روایات کو ترک کیا اسلام کی نئی تعبیریں دیں۔ اس پریکٹیکل ازم کے باوجود آپ کو عوام نے رد کردیا ۲۰۰۲ء میں مذہبی جماعتوں کو گیارہ فی صد ووٹ ملے ۲۰۱۸ء میں صرف نو فی صد یہ آپ کے پریکٹیکل ہونے کا نتیجہ ہے مخالفین بھی آپ کو بے اصول سمجھتے ہیں اور آپ کو اپنی صفوں کے لوگ بھی آپ کو اصولوں سے منحرف سمجھتے ہیں لہٰذا بہت سی مذہبی جماعتوں کے لوگوں نے اس مرتبہ تحریک انصاف کو بھی ووٹ دیے کہ جب بے اصولی کی ہی سیاست ہے تو کوئی نیا بے اصول چہرہ بھی آجائے تو کیا ہرج ہے۔ اپنے اصولوں پر مصالحت و مفاہمت کرنے کے باوجود اپنی اقدار کو نظر انداز کرنے کے باوجود عوام کو خوش کرنے کے لیے مذہبی جماعتوں نے سیکولر جماعتوں کے جو بھی طریقے اختیار کیے، وہ کامیاب کیوں نہیں ہوسکے؟ انحراف کے باوجود بھی آپ کو آج تک کامیابی نہیں ملی۔ تو ایسے پریکٹیکل ازم کا

کیا فائدہ ہے؟ اس پر گفتگو ہو سکتی ہے، ہونی چاہیے، کیوں کہ حکمت عملی عقیدہ نہیں۔ عملی طریقہ ہے ایک حکمت عملی ناکام ہوگئی تو اس پر بات کیوں نہیں ہو رہی۔ اس لیے کہ ہم اپنی حکمت عملی کو الحق سمجھتے ہیں۔ یہ غلطی ہے۔ اس میں تبدیلی وتغیر کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ نہ اس پر بحث سننا چاہتے ہیں۔ حکمت عملی مسلسل بدلتی رہتی ہے، بدلنی چاہیے۔

ظالم کافر حکمرانوں کے خلاف خاموش رہنا گناہ کبیرہ ہے یا نہیں

کیا جہاد دوسرے کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق کیا جاتا ہے؟

سوال: جناب سراج الحق صاحب نے گیارہ جولائی کو اپنی تقریر میں فرمایا کہ

۲۰۱۸ء کا الیکشن افراد کے درمیان نہیں تہذیبوں، مغربی استعمار کے وفاداروں امریکی اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹوں اور نظریہ پاکستان پر ایمان رکھنے والوں کے درمیان ہے یہ خیر اور شر حیا اور بے حیائی کے درمیان معرکہ اور منبر و محراب اور سیکولرازم اور اسلام کے درمیان لڑائی ہے۔ یہ حق و باطل کی جنگ کی عالمی جنگ ہے یہ جنگ فلسطین اور کشمیر میں بھی جاری ہے اور پاکستان میں بھی لڑی جا رہی ہے۔ ۲۵ جولائی کو قوم کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ محمدؐ کے غلاموں کے ساتھ ہے یا سیکولر اور لبرل ازم کے پیروکاروں کے ساتھ۔ قوم کو ایک بار پھر حسینؓ کے پیروکاروں اور یزید کے وفاداروں کے درمیان معرکے میں حق کا ساتھ دینا ہوگا۔ سینیٹر سراج الحق نے کہا کہ پی ٹی آئی سیاسی یتیم خانہ ہے اور اب واشنگ مشین بن گئی ہے۔ کل تک جنہوں نے پیپلز پارٹی اور نون لیگ کی حکومتوں میں رہ کر پاکستان کو لوٹا وہ آج پی ٹی آئی کے ٹکٹ ہولڈرز ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ۷۰ سال تک پاکستان پر حکومت کرنے والوں نے پاکستان کے نظریے اور جغرافیے کے ساتھ بے وفائی اور غداری کی جس کی وجہ سے پاکستان دولخت ہوا۔ کرپٹ قیادت نے پاکستان کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی غلامی کی ہتھکڑیاں پہنائیں۔ پاکستان کی عزت وغیرت کو نیلام کیا۔ انہوں نے کہا کہ اب پاکستان کے عوام اللہ کے نظام کے مقابلے میں کسی لبرل اور سیکولر نظام کو برداشت نہیں کریں گے۔ [جسارت ۱۲ جولائی ۲۰۱۸ء]

مولانا فضل الرحمان نے بھی فرمایا کہ یہودی لابی کو ایمانی قوت اور ووٹ سے شکست دینی ہے چند نادیدہ قوتیں ملک میں سیکولر نظام چاہتی ہیں اور وہ یہودی لابی کے لیے کام کر رہی

ہیں [جنگ کراچی ۱۳ جولائی ۲۰۱۸ء]

سراج الحق صاحب نے فرمایا کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کو قوم نے ایک دو بار نہیں کئی بار آزمایا ہے اب تحریک انصاف میں بھی وہی لوگ جمع ہیں جن کا احتساب ہونا چاہیے تھا مگر الیکشن کمیشن اور نیب نے انہیں کھلی چھٹی دی ہے ایم ایم اے نے قوم کے سامنے وہ ہیرے پیش کیے ہیں جن کے کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا اگر ووٹ کے ذریعے مذہب بیزار سیکولر اور بد دیانت لوگ اقتدار میں آئے تو ان کے گناہوں اور ملک کو پہنچنے والے نقصانات سے کوئی ووٹر بری الذمہ نہیں ہوسکتا [جسارت ۲۵ جولائی ۲۰۱۸ء] متحدہ مجلس عمل کے صدر فضل الرحمان اور دیگر عہدیداران نے مشترکہ بیان میں اپیل کی ہے ووٹر کتاب کو ووٹ دیں یہ انتخابات سیکولر مادر پدر آزاد اور لبرل نظام کو شکست دینے کے لیے فیصلہ کن گھڑی ہے اس الیکشن میں ملک دشمن شکست کھائیں گے [جسارت ۲۵ فروری ۲۰۱۸ء] ووٹ امانت ہے کسی خائن اور بد کردار کے حوالے نہ کریں: سراج الحق [جسارت ۲۵ جولائی ۲۰۱۸ء]

(۱) ان بیانات میں ایم ایم اے نے الیکشن کو حق و باطل کا معرکہ قرار دیا

(۲) وطن کے حامیوں اور وطن کے دشمنوں کے درمیان جہاد قرار دیا

(۳) الیکشن کو افراد کے درمیان نہیں دو تہذیبوں کے درمیان مقابلہ قرار دیا

(۴) مغربی استعمار کے وفاداروں امریکی اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹوں اور نظریہ پاکستان کے عاشقوں کے درمیان جنگ قرار دیا۔

یہ حسین و یزید کے درمیان معرکہ تھا انتخابات کا نتیجہ سامنے آیا تو باطل جیت گیا وطن کے دشمن مغربی تہذیب کے ایجنٹ عمران یہودی کی پارٹی جس کے چار حرامی بچوں کا ذکر ریحام نے کیا جو بھارت کا دوست بھی ہے وہ جیت گیا اس کی پارٹی جیت گئی ایم ایم اے نے نتائج قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فضل الرحمان نے کہا کہ انتخابی عملہ فوج کے ہاتھوں یرغمال بنا رہا یہ الیکشن نہیں سلیکشن ہے عوامی مینڈیٹ پر اسٹیبلشمنٹ نے ڈاکہ ڈالا ہے ہم ان کو بتانا چاہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے سب کچھ عوام کے ہاتھ میں [جسارت ۲۸ جولائی] حیرت کی بات یہ ہے کہ ایم ایم اے کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس میں مسلم لیگ (ن)، پیپلز

پارٹی، ایم کیو ایم، اے این پی کو بھی بلایا گیا بلکہ اجلاس کی صدارت شہباز شریف اور مولانا فضل الرحمان نے مشترکہ طور پر کی [جسارت ۲۸ جولائی ۲۰۱۸ء] اس تضاد کی توجیہہ ہم کیسے کریں عوام ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ جو کل تک بدمعاش غنڈے امریکی ایجنٹ تھے یزید تھے کافر تھے لبرل تھے ملک دشمن تھے لٹیرے، چور، غنڈے غاصب تھے سراج الحق نے کہا تھا کہ ان کو ہم آ کر جیل میں ڈالیں گے ان کو ایم ایم اے کے اجلاس میں شریک کیوں کیا گیا؟ اب پارلیمنٹ میں مسلم لیگ (ن)، پیپلز پارٹی، اے این پی کے ساتھ ایم ایم اے حکومت بنا رہی ہے فیصلہ ہو گیا ہے ۳/اگست کے اخبارات میں خبریں شائع ہوئی ہیں شہباز شریف وزیر اعظم کے امیدوار ہیں ایم ایم اے نے ان کو نامزد کیا ہے تو یہ کیا منافقت ہے، حکمت ہے، مصلحت ہے، مجبوری ہے، جبر ہے، دباؤ ہے، سیاست ہے، جھوٹ ہے، کیا ہے؟

(۱) ان کا دعویٰ تھا کہ یہ انتخابات کفر و اسلام حق و باطل پاکستان کی وفاداری اور دشمنی کا معرکہ ہے انہوں نے اپنے سوا اور ایم ایم اے نے اپنے سوا۔ دیگر جماعتوں کو امریکہ، مغرب، سیکولرازم لبرل ازم کا ایجنٹ اسلام دشمن پاکستان دشمن قرار دیا اور اب ایم ایم اے کا فیصلہ یہ ہے کہ دھاندلی میں فوج ملوث ہے یہ بیان ہی متضاد (Oxymoron) ہے کیوں کہ اگر ایم ایم اے اور مذہبی جماعتوں کے اس موقف کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کی فوج ہی پاکستان کی دشمن ہے امریکہ کی حامی ہے باطل والوں کے ساتھ ہے بدعنوان قیادت کو پسند کرتی ہے نظریہ پاکستان کے دشمنوں کو اقتدار دلاتی ہے مغربی استعمار کے وفاداروں اور امریکہ کے پٹھوؤں کو اقتدار کا راستہ دکھاتی ہے ظاہر ہے یہ بات تو کوئی شخص تسلیم ہی نہیں کر سکتا کہ پاکستانی فوج پاکستان کی دشمن ہے کیوں کہ اس کا وجود اس کی مراعات اس کی سہولیات عزت پاکستان کے دم سے ہے اگر پاکستان نہیں ہوگا تو فوج بھی نہیں ہوگی اگر پاکستان مشرقی پاکستان کی طرح ٹوٹ گیا تو وہ انڈیا کا حصہ ہوگا پاکستان کی فوج کا اپنا مفاد یہ ہوگا کہ وہ کبھی انڈیا کا حصہ نہ بنے لہٰذا منطقی طور پر ایم ایم اے کا یہ مقدمہ سمجھ سے باہر ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آج تک کسی مذہبی جماعت کے کسی رہنما نے ستر سال میں فوج کے کردار پر کبھی انگلی نہیں اٹھائی اسے کبھی غدار وطن نہیں کہا ہمیشہ اسے مدینہ پاکستان کا وفادار کہا ہمیشہ اس کے حلیف رہے اب اچانک ان کو کیا ہو گیا؟ اور فوج ستر سال تک ٹھیک رہنے کے بعد ۲۵

جولائی کو اچانک وطن دشمن اسلام دشمن کیسے ہوگئی؟ دعویٰ جتنا بڑا ہو اس کی دلیل بھی اتنی مضبوط ہونا ضروری ہے۔ تمام جماعتوں کو الیکشن کے نتائج میں فوج کا کردار نظر آرہا ہے تو تمام جماعتیں فوج سے بات کیوں نہیں کررہیں امریکہ سے لڑنے والے فوج والوں سے بات کیوں نہیں کرتے کیا ان میں اتنی جرات بھی نہیں ہے؟ اگر فوج واقعی ایسی ہے جیسے کہ ایم ایم اے فرائیڈے اسپیشل جسارت اور شاہ نواز فاروقی اپنے کئی کالموں میں کہہ چکے ہیں تو پھر جماعت اسلامی ایسے جعلی الیکشن میں شامل ہوکر اپنا وقت کارکنوں کا پیسہ صلاحیت کیوں ضائع کررہی ہے؟ ستر سال سے یہ کھیل کیوں ہورہا ہے؟ فوج کی اصلاح کے لیے کیا لائحہ عمل ہے کیا صرف شاہ نواز فاروقی کے کالم کافی ہیں؟

(۲) دوسرا بہت بڑا اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ تمام مذہبی جماعتیں تحریک لبیک ہو یا پاکستان سنی تحریک یا جماعت اہل سنت یا سنی علماء کونسل یا لبیک یارسول اللہ، لبیک پاکستان، جماعت الدعوۃ ایم ایم اے یا جماعت اسلامی ان سب کا متفقہ مشترکہ عقیدہ ہے پاکستان مدینہ ثانی ہے اور پاکستان کی حفاظت کا فریضہ صرف اور صرف پاکستانی فوج ہی ادا کررہی ہے لہٰذا تمام علماء تمام مذہبی جماعتیں NAP میں فوج کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہیں اور پیغام پاکستان کا فتویٰ پاکستانی فوج کے آپریشن ردالفساد، ضرب عضب، ضرب مومن اور آئندہ مستقبل میں ہونے والے ہر آپریشن کی حمایت میں دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستانی فوج اس مدینہ کی اصل محافظ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جو فوج مدینہ کی حفاظت کررہی ہے وہ مدینہ کے دشمنوں کو مغرب کے ایجنٹوں کو یہودی بیوی والے عمران خان کو چار حرامی بچوں کے باپ کو دھاندلی کرکے الیکشن میں کامیاب کرادے اگر اس نے واقعی ایسا کوئی کام کیا ہے تو اس میں بھی علماء کے دائمی اصول حکمت کے تحت کوئی حکمت عملی ہوگی اصول مصلحت سازی کے تحت کوئی مصلحت ہوگی یہ بات ہم علماء کی اجتماعی ستر سالہ حکمت عملی کے تناظر میں اس کے منہاج فکر میں ان کے مطابق بیان کررہے ہیں یہ ہمارا موقف نہیں ہے لہٰذا علماء اور مذہبی جماعتوں کو اس بارے میں فوج سے رابطہ کرنا چاہیے اور فوج سے مشورہ کرنا چاہیے آج تک تمام لبرل سیکولر ملحدین علماء مذہبی جماعتوں پر ملٹری ملا اتحاد کی پھبتی کستے رہے ہیں علماء مذہبی جماعتوں نے ہمیشہ فوج کی حمایت کی ہے علماء کے فتوے کی روشنی میں ہی طالبان کے خلاف فوج نے

آپریشن شروع کیا علماء نے ہی طالبان پر بمباری کی Premptive war کی اجازت دی تاکہ فتنہ وفساد کا خاتمہ ہوجائے علماء نے ہی پیغام پاکستان کے ذریعے فوج کے شانہ بہ شانہ کھڑے رہنے کا عندیہ دیا پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۲۰۱۷ء، ۲۰۱۶ء میں علماء نے فوج کی حمایت میں ۲۳ ؍مارچ، ۱۴؍اگست اور ۶؍ستمبر کو دینی مدارس میں پرچم کشائی کی تقاریب، قومی ترانے کی تقاریب اور قومی جشن کے پروگرام کیے۔ اس سے پہلے ستر سال تک کبھی ان کو اپنی وفاداری، حب الوطنی، ثابت کرنے کے لیے مدارس میں اس قسم کے پروگرام کرنے اس قسم کی تقاریب منعقد کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا تو اب اچانک فوج پر الزام تراشی کا کیا مطلب ہے؟ اگر ملک کی فوج ہی ملک کی دشمن ہے تو پھر ملک کی حفاظت کون کرے گا؟ یا تو علماء کی پہلی حکمت عملی غلط تھی یا آج جو حکمت عملی وہ اختیار کررہے ہیں وہ غلط ہے۔ دونوں میں تطبیق ممکن ہی نہیں لہٰذا علماء سب سے پہلے اس سلسلے میں اپنی پوزیشن واضح کریں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟ اور ماضی میں وہ کہاں کھڑے تھے اور اب حقیقت حال کیا ہے؟ صرف حمایت ومخالفت میں بیانات دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا امریکہ نے بیان دیا ہے کہ ہمارے دشمن متشدد اسلامی گروہ الیکشن میں ہار گئے جنرل باجوہ صاحب نے بھی اسی قسم کا بیان دیا کہ الیکشن میں دشمن کو شکست ہوئی اس پر مولانا فضل الرحمان کا یکم اگست ۲۰۱۸ء کو جسارت میں بیان شائع ہوا ہے کہ باجوہ صاحب اس بیان کی وضاحت کریں دشمن سے کیا مراد ہے؟ مولانا فضل الرحمان نے خواہ مخواہ باجوہ صاحب سے وضاحت طلب کی باجوہ صاحب نے اس سے پہلے بلوچستان میں فرمایا تھا کہ دینی مدارس جو طلباء تیار کررہے ہیں وہ معاشرے پر بوجھ ہیں تب مولانا نے وضاحت طلب کیوں نہیں کی باجوہ صاحب نے اپنے تناظر میں ترقی GDP، Exchange Value کے تناظر میں بالکل صحیح بات کی کہ اتنی بڑی تعداد جو مدرسوں سے نکل رہی ہے یہ کیا کرے گی روزگار کا کیا ہوگا؟ GDP میں اضافہ ترقی کیسے ہوگی دینی علم سے تو ترقی نہیں ہوسکتی جب علماء خود کہہ رہے ہیں کہ اسلام ترقی چاہتا ہے ترقی دلاتا ہے تو وہ اس سوال کا جواب دیں کہ دینی علم کی Exchange Value ہے یا نہیں وہ عصر حاضر سے واقف ہی نہیں ہیں وہ عصر حاضر کی اصلاح نہیں چاہتے تو ان کو اپنے عقیدے تاریخ شریعت کی اصلاح کرنی ہوگی اگر وہ امت کو مغرب کو فوج کو علمی طور پر نہیں بتا سکتے۔ کہ اسلام ترقی کو عقیدہ کیوں نہیں مانتا

اور ترقی کے باطل عقیدے کی اسلامی تعبیر پیش کرتے رہے تو پھر آپ کے دین کو ترکی کی طرح ٹھیک کر دیا جائے گا باجوہ صاحب کا اعتراض جدیدیت جدید ریاست کے تناظر میں درست ہے لیکن ظاہر ہے اسلامی تناظر میں ان کا یہ اعتراض ٹھیک نہیں ہے باجوہ صاحب کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ فوج اور اسلامی جماعتوں کے تعلقات اب اُس سطح سے اِس سطح تک آ گئے ہیں؟

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اسلامی جماعتوں کا کردار سیاست میں ختم ہو گیا ہے اب مذہبی جماعتوں کی ریاست کے لیے کوئی اہمیت وقعت باقی نہیں رہی ان سے جو کام لیا جا سکتا تھا وہ لے لیا گیا اب وہ آرام فرمائیں۔

مولانا فضل الرحمان نے شکوہ کیا ہے کہ صوبہ سرحد میں الیکشن میں دھاندلی کے خلاف زبردست احتجاجی مظاہرے ہو رہے ہیں مگر میڈیا اس کی خبر نہیں دے رہا بعض علاقوں میں پر تشدد مظاہروں میں چند مظاہرین شہید ہوئے لیکن اخبارات میڈیا نے خبر نہیں دی اکثر مذہبی ، جماعتوں کو شکوہ ہے کہ الیکشن کے نتائج کے موقع پر بھی میڈیا نے دوسرے نمبر پر جیتنے والے کسی بھی مذہبی جماعت ایم ایم اے، تحریک لبیک یا کسی مذہبی جماعت کے امیدوار کا نہ تو نام لیا نہ ووٹوں کی تعداد بتائی تمام مذہبی جماعتیں میڈیا سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ ان کی کوریج کرے کیا آپ میڈیا کے محتاج ہیں؟ وہ آپ کا محتاج کیوں نہیں ہے؟ علماء اور مذہبی جماعتوں نے میڈیا سے تعلقات بنانے کی بہت کوشش کی لیکن فائدہ کچھ نہیں ہوا کیوں کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اینکر پرسن، میڈیا کے صحافی اصل طاقت ان کے پاس ہے لہذا ان کی آم پارٹیاں، دعوتیں، تعلقات ، میل جول، کھلے سمندر میں جہازوں پر ان کی دعوتیں، کھانے الیکشن میں مذہبی جماعتوں کے کسی کام نہ آ سکے۔ ان کو معلوم ہی نہیں کہ میڈیا اور آزادی اظہار رائے کا مطلب میڈیا کے مالک کی آزادی ہے۔ میڈیا کے مالک نے اربوں روپے کا سرمایہ اس لیے لگایا ہے کہ مولویوں کا سچ بیان کرے میڈیا کو کاروبار اشتہار منافع اجازت نامہ آپ دیتے ہیں؟ آپ کی بات وہ کیوں سنے آپ کو آج تک یہی نہیں معلوم کہ آزادی اظہار رائے میڈیا کی آزادی اخبار نکالنے کی آزادی کا کیا مطلب ہے ہر شخص میڈیا اور اخبار کے لیے حکومت سے اجازت نامہ لے سکتا ہے مگر یہ کام کرنے کے لیے کروڑوں روپے چاہئیں یعنی اس آزادی

کا استعمال صرف سرمایہ دار کے لیے ہے اصولی طور پر آزادی سب کے لیے ہے عملی طور پر آزدی صرف اس کے لیے ہے جو سرمایہ دار ہے یا قرضہ لے سکتا ہے سرمایہ دار میڈیا کے مالک کے خریدے ہوئے صحافی اینکر پرسن اس کی آزادی منافع اور سرمایہ میں اضافہ کے لیے کام کریں وہ اس کے منافع میں اضافہ کریں یا آپ کی سچائیاں بیان کریں آپ اپنا میڈیا ہاؤس کھول لیں مذہبی جماعتوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کارپوریٹ بیسڈ میڈیا اور اسٹیٹ بیسڈ میڈیا میں کیا فرق ہے انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ میڈیا مارکیٹ کا نمائندہ ہے اور جدید ریاست مارکیٹ سائنس سرمایہ کی تنظیم کا نام ہے سرمایہ دارانہ نظام مارکیٹ ریاست کی سرپرستی کے بغیر ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ امریکہ جیسے ملک میں ٹرمپ نے میڈیا کو شکست دی میڈیا کو ذلیل کیا دنیا کی تاریخ میں کسی سیاسی جماعت کے رہنما نے الیکشن کے زمانے میں صحافیوں کی اور ان کے اداروں کی اتنی بے عزتی نہیں کی جتنی ٹرمپ نے کی اور میڈیا کے بغیر الیکشن میں کامیابی حاصل کی علماء کے پاس تو مساجد، مدارس، جمعہ کا منبر، خانقاہ، ذکرو اذکار کے حلقے سب کچھ ہیں اس کے باوجود وہ تمام میڈیا والے سے درخواستیں کررہے ہیں میڈیا علماء کو اپنا اصل دشمن سمجھتے ہیں اسلامی حکومت آئے گی تو کیا میڈیا کو یہ سب کچھ کرنے دے گی جو وہ کررہا ہے۔ حیرت ہے کہ علماء اپنے دشمن سے اپنی کوریج کا مطالبہ کررہے ہیں ۔ مذہبی جماعتوں میں آج کل بڑے بڑے دانشور امریکہ برطانیہ سے میڈیا پر کچھ پڑھ کر آگئے ہیں ان سے کوئی پوچھے کہ ٹرمپ نے میڈیا کو ذلیل کرکے صحافیوں سے لڑکر ان کی مخالفت مول لے کر بھی کیسے کامیابی حاصل کی۔ میڈیا اسلام کا اسلامی جماعتوں کا دشمن ہے اور یہ اسی سے شکایت کررہے ہیں۔ ابوجہل سے شکوہ ہورہا ہے کہ تم میدان بدر میں لشکر اور تلوار لے کر ہمارے خلاف کیوں نکل آئے!! حیرت ہے کہ علماء اور مذہبی جماعتیں کس دنیا میں زندہ ہیں! وہ میڈیا پر لعنت بھیج کر اپنے فطری مذہبی ذرائع کو استعمال کرنے کے بجائے میڈیا سے مدد مانگ رہی ہیں دنیا میں حج کے بعد سب سے بڑے مذہبی اجتماعات تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی کے ہوتے ہیں ان میں میڈیا کتنا استعمال ہوتا ہے مذہبی جماعتیں کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے تیار نہیں جو کچھ مغرب میڈیا کے بارے میں اس کی قوت کے بارے میں بتاتا ہے وہ فوراً اس پر ایمان لے آتی ہیں اور متبادل کی تلاش شروع کردیتی ہیں حالاں کہ متبادل تو موجود ہے اس پر ان کو یقین نہیں ہے۔

(۳) صرف فوج کا مسئلہ نہیں ہے خود علماء اور مشائخ، بزرگوں، پیروؤں سے متعلق بھی ایک مسئلہ ہے سیال شریف جو پنجاب کی بہت بڑی گدی ہے پیر سیال شریف صاحب کے حلقہ اثر میں ۲۶ حلقے ہیں جہاں سے قومی صوبائی اسمبلی کے ۲۶ امیدواران کی حمایت سے کامیاب ہوتے ہیں پھر پیر صاحب کا پورے پنجاب پر اثر ہے سیال شریف ابھی تک مسلم لیگ کے ساتھ تھا لیکن ختم نبوت کے مسئلے پر اختلاف کے بعد انہوں نے مسلم لیگ کی حمایت کے بجائے تحریک انصاف کی حمایت کا اعلان کیا عمران کی دستار بندی ہوئی حضرت والا نے تقریر کی اور فرمایا کہ ہمارے بزرگوں نے پاکستان بنانے کے لیے قائداعظم کا ساتھ دیا تھا ہم پاکستان بچانے کے لیے عمران خان کا ساتھ دے رہے ہیں تو کیا حضرت پیر سیالوی صاحب کو ان کے خانوادے کو ان کے متوسلین، متعلقین، مقلدین، مریدین کو اور ان سب لوگوں کو جنہوں نے پیر صاحب کے حکم پر تحریک انصاف کو ووٹ ڈالا اور پنجاب میں نواز شریف کو شدید نقصان پہنچایا تو کیا یہ سب پاکستان دشمن، وطن دشمن، یہودی کے حامی، امریکہ کے حامی، سیکولرازم، لبرل ازم کے حامی ہیں؟ کیا کوئی عالم دین، بریلوی مکتب فکر کا عالم بھی سیال شریف کے بارے میں یہ دعویٰ کرسکتا ہے؟

(۴) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ انتخابات میں دھاندلی ہوئی یا نہیں ہوئی؟ اگر ہوئی تو یہ دھاندلی کس نے کرائی؟ اگر فوج نے کرائی تو اس کو کیا فائدہ ہوا؟ اگر کسی اور ادارے نے یہ دھاندلی کرائی تو اس ادارے کی پشت پر کون تھا؟ اور دھاندلی کا مسئلہ الیکشن کی آدھی رات گزرنے کے بعد اور اگلے دن ۲۶ جولائی کو کیوں اٹھایا گیا؟ اس سے پہلے یہ مسئلہ کیوں نہیں اٹھا؟ اگر دھاندلی کا امکان تھا تو ایم ایم اے اور دیگر سیاسی جماعتوں نے اس کی منصوبہ بندی کیوں نہ کی؟ اگر انہیں یقین تھا کہ دھاندلی ہو رہی ہے ، ہونے والی ہے، ہو جائے گی یا ہو کر رہے گی تو وہ ۲۶ جولائی تک کیوں سوتے رہے اور کفر و اسلام کی جنگ میں دھاندلی کے خطرے کو انہوں نے ایک عظیم خطرے کے طور پر کیوں پیش نہیں کیا اور اس خطرے سے نمٹنے کے لیے ۱۹۷۷ء کی طرح کوئی منصوبہ بندی کیوں نہیں کی؟ اس غضِ بصر، لا پروائی، لاتعلقی، بے نیازی کا سبب کیا تھا؟ نواز شریف کے ساتھ جو کچھ عدالتیں جس طرح کر رہی تھیں اس پر کسی جماعت نے ہمدردی کے دو بول بھی ادا نہیں کیے تمام جماعتیں ایم ایم

اے سب خوش تھے سب علماء کا خیال تھا کہ حضرت ممتاز قادری شہید کو پھانسی دینے کے جرم کی سزا اللہ دے رہا ہے اس لیے اسے ہر جگہ بری طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اس نے عاشقِ رسول کا احترام نہ کیا شہباز شریف نے وعدہ کیا کہ حضرت والا کو پھانسی نہیں دی جائے گی مگر اس نے وعدہ پورا نہیں کیا عدالت سے امید تھی وہ رہا کر دے گی لیکن جسٹس شوکت عزیز صدیقی نے شریعت کے بجائے ملکی قانون کا احترام کرتے ہوئے دہشت گردی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا آج حضرت بہت بڑے شیخ بنے ہوئے ہیں وہ قادری شہید کی پھانسی کے خلاف کوئی فیصلہ نہ دے سکے اگر یہ مان لیا جائے کہ نواز شریف کو شہید ممتاز قادری کی آہ نے ہلاک کر دیا تو پھر سوال یہ ہے کہ ممتاز قادری شہید کے قاتل نواز شریف کی مسلم لیگ اور شہباز شریف کو ایم ایم اے نے اپنے اجلاس کی صدارت کے لیے کیوں مدعو کیا؟ شہباز شریف کو ایم ایم اے نے وزیر اعظم کے لیے کیسے نامزد کر دیا ایک کرپٹ پاکستان دشمن انڈیا کا ایجنٹ اچانک ایم ایم اے کی واشنگ مشین سے صاف ستھرا ہو کر باہر کیسے آ گیا؟ جس نے ممتاز قادری سے وفا نہیں کی وہ تم سے وفا کرے گا؟ دینی جماعتوں کی یہ حالت ہے۔

(۵) ۳؍اگست کا جسارت اور فرائیڈے اسپیشل پڑھ لیجیے جماعت اسلامی اور مذہبی جماعتوں کی دو عملی اور ناکام ترین سیاست کی حقیقت واضح ہو جائے گی جسارت کی سرخی ہے ان لیگ پی پی پی ایم ایم اے نے حکومت بنانے کا اعلان کر دیا وزیر اعظم شہباز، اسپیکر پیپلز پارٹی کا اور ڈپٹی اسپیکر ایم ایم اے کا یہ ہے مذہبی جماعتوں کی حیثیت اور اصول پرستی اور اسلام اور کفر کی جنگ یزید اور حسین کو اکٹھا کر دینا ایم ایم اے کا کارنامہ ہے اس پر اسے فخر کرنا چاہیے۔ ۳؍اگست کے اخبار میں سراج الحق کا بیان ہے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ ۳۵ سال مارشل لاء بھگتے اور شریعت کے بغیر نام نہاد جمہوریتوں کو بھی بھگتا لیکن عوام کے مسائل حل نہیں ہوئے [جسارت ۳؍اگست ۲۰۱۸ء] تو اسمبلی میں ایم ایم اے اب کون سی امید اور کون سا اسلام لا رہی ہے؟

سوال: جماعت اسلامی اور تحریک انصاف نے سرحد میں اتحاد کیا اگر تحریک انصاف ملک دشمن جماعت تھی استعماری ایجنٹ جیسا کہ ایم ایم اے اور سراج الحق کا دعویٰ ہے تو یہ اتحاد کیوں تھا؟ فرائیڈے اسپیشل کی رپورٹ ہے کہ اپریل میں سینٹ کے الیکشن کے موقع پر

حکمران تحریک انصاف انتخاب سے ایک دن قبل تک جماعت اسلامی سے کسی مفاہمت کے لیے تیار نہیں تھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی نے اے این پی کی پیش کش پر اے این پی اور مسلم لیگ (ن) کے ایک دھڑے کے ساتھ اتحاد کر لیا اور اس کے نتیجے میں اپنا امیدوار بآسانی کامیاب کرالیا۔ سراج الحق نے سینیٹ کے انتخابات کے موقع پر خرید وفروخت اور چیئر مین سینیٹ کے انتخابات کے لیے کسی غیر مرئی طاقت کے اشارے کا ذکر کیا اور بتایا کہ جب انہوں نے وزیر اعلیٰ خیبر پختون خواہ سے پوچھا کہ آپ نے صادق سنجرانی اور اس سے بڑھ کر پیپلز پارٹی کے سلیم مانڈوی والا کو ووٹ کیوں دیا؟ تو ان کا کہنا تھا کہ انہیں اوپر سے حکم تھا سب جانتے ہیں کہ اوپر کے حکم کا کیا مطلب ہے؟ جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے اس نے اپنی ازلی حریف پیپلز پارٹی کو سینیٹ میں ووٹ نہیں دیا۔ جماعت اسلامی مسلم لیگ (ن) کے ساتھ بھی کسی اتحاد میں نہیں جائے گی بلکہ ایم ایم اے مضبوط کر کے میدان میں اتارے گی۔ [فرائیڈے اسپیشل ۲۷/اپریل ۲۰۱۸ء] اسی رسالے میں سراج الحق کا بیان ہے بد عنوانی میں ڈوبے ہوئے نظام کو سراج الحق کا چیلنج سینیٹ الیکشن پر میڈیا سے گفتگو میں سراج صاحب نے کہا کہ

سینیٹرز کی خرید وفروخت سے سینیٹ کی اخلاقی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ جس طرح بکنے والے مجرم ہیں اسی طرح خریدنے والے بھی مجرم ہیں صرف چند گھوڑے نہیں پورا اصطبل بک گیا۔ ہم نے پہلے مرحلے میں رضا ربانی کا نام پیش کیا تھا لیکن آصف زرداری نے اپنے ایک کارکن کی حمایت نہیں کی۔ نظام کو ٹھیک کرنے کے لیے ۷۰ سال سے سیاست اور جمہوریت کے نام پر آمریت مسلط کرنے والے اژدہوں کے دانت توڑنے اور ہاتھیوں کی سونڈ مروڑنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ٦ ہزار کرپشن کنگز جیلوں میں نہیں جاتے کرپشن کے خاتمے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔ مرکزی حکومت لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کے دعووں کی ناکامی پر قوم سے معافی مانگے یا اپنے جھوٹے اور ناکام ہونے کا اعلان کرے۔

آئندہ انتخابات میں روایتی پارٹیوں کا راستہ روکنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کریں گے۔ ۷۰ سال سے مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے نام سے اقتدار پر قابض رہنے والوں نے عام آدمی کا استحصال کیا۔ اسلام آباد میں قبرستان کی سی خاموشی ہے۔ سیاست اور جمہوریت یرغمال

ہے کوئی غریب اسمبلی میں نہیں پہنچ سکتا۔ حکمرانوں نے قوم کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے قرضوں کی جن زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے ان کو صرف اسلامی حکومت توڑ سکتی ہے اور ملک وقوم کے تمام مسائل کا حل صرف نظام مصطفیٰ میں ہے۔ الیکشن آتے ہی پرندے گھونسلے بدلنے لگتے ہیں اور ایک گھونسلے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گھونسلے میں جا بیٹھتے ہیں مگر عوام ان کو خوب پہچانتے ہیں یہ کعبے کے غلاف میں بھی جا چھپیں تو ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے اور ان سے قومی دولت کی پائی پائی وصول کریں گے۔ اسٹیٹس کی قوتوں اور عالمی اسٹیبلشمنٹ کے مہروں نے ۲۲ کروڑ عوام کو شیطانی چکر میں پھنسا رکھا ہے۔ کرپشن میں لپٹے لوگ ایک پارٹی کو چھوڑ کر دوسری جماعتوں میں جا رہے ہیں اور دوسری جانب بدقسمتی یہ ہے کہ ہم بھی ووٹ اس کو دیتے ہیں جنہیں الیکشن سے قبل گالیاں دیتے نہیں تھکتے، جب تک کرپٹ حکمران عرش پر اور عوام فرش پر ہیں حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ حکمران بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹ ہیں حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے عدلیہ کو مداخلت کرنا پڑی اگر حکومت اپنے فرائض پورے نہ کرے تو پھر عدالتوں سمیت دیگر اداروں کو مداخلت کی جگہ مل جاتی ہے۔ جماعت اسلامی کے اس کردار کو آپ کس نظریے سے دیکھتے ہیں؟ سراج الحق صاحب نے ۷ ۱۲پریل ۲۰۱۸ء کو کہا کہ پی پی پی، تحریک انصاف سب گھوڑے ہیں کعبہ کے غلاف میں چھپیں گے تو ان کو نکال لیں گے جیل بھیجیں گے مگر ۲۷ جولائی کو صرف تین مہینے بعد یہ تمام کرپٹ پی پی پی، اے این پی، مسلم لیگ، ایم ایم اے کے ساتھ اتحادی بن گئے۔

جواب: فرائیڈے اسپیشل جماعت اسلامی کا رسالہ ہے جماعت اسلامی نے تحریک انصاف سے سرحد میں اتحاد کیا پھر الگ ہوگئی پھر ایم ایم اے بنایا اور اب ایم ایم اے کی APC بن گئی ہے جس میں پی پی پی، تحریک انصاف، اے این پی، مسلم لیگ کے بھی کچھ لوگ جو دوسری جماعتوں میں آ گئے موجود ہیں یہ سیاسی کھیل ہے اس میں نظریاتی سیاست کہاں چل سکتی ہے یہ آپ کا سوال ہم سے غیر متعلق ہے ہم سے نہ پوچھیے اس کے لیے سراج الحق صاحب سے رجوع کیجیے یا شاہ نواز فاروقی سے شاہ نواز فاروقی صاحب جس زور وشور سے پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور نواز شریف کے خلاف زہرناک، زہر آلود کالم لکھتے رہے وہ بتائیں ہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسی اسلامی سیاست ہے اسلامی جمہوریت کیا یہی ہوتی ہے؟ کوئی ذہین، پڑھا لکھا، ذی

عقل آدمی اس قسم کی سیاست سے متاثر نہیں ہوسکتا لہٰذا مذہبی جماعتوں کے ذہین لوگ اپنی جماعتوں سے الگ ہورہے ہیں۔لبرل بن رہے ہیں لبرل لوگوں کی جرات مندی انھیں اچھی لگتی ہے حالانکہ اس کے پیچھے عالمی طاقتوں کی حمایت ہے۔

سوال: ۲۷ جولائی کو ایم ایم اے کی APC نے انتخابی نتائج کو مسترد کردیا دوبارہ انتخابات کے لیے تحریک چلانے کا اعلان کیا اسے سلیکشن کہا اور کہا کہ انتخابی عملہ فوج کے ہاتھوں یرغمال بنا رہا جمہوریت کو آزاد کرانے کی لڑائی لڑیں گے مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جائے گا نتائج کا اندازہ پہلے ہی ہوگیا تھا [جسارت ۲۸ جولائی ۲۰۱۸ء] ۲۷ جولائی کو یہ اعلان کیا اور اسی ایم ایم اے کی APC میں ۲ اگست کو اعلان کیا کہ ن لیگ پی پی پی مجلس عمل نے حکومت بنانے کا اعلان کردیا وزیراعظم ن لیگ اسپیکر پی پی پی ڈپٹی اسپیکر مجلس عمل کا ہوگا (جسارت ۳؍ اگست ۲۰۱۸ء) ایم ایم اے کی ۲۵ جولائی تک کا نقطہ نظر پھر ۲۷ جولائی کا موقف اور اب ۳؍ اگست کا موقف ان میں کیسے تطبیق پیدا کی جاسکتی ہے یہ تو تمام متضاد بیانات نظر آتے ہیں آپ کی کیا رائے؟

جواب: دینی سیاست کی ستر سالہ تاریخ کا مطالعہ کیجیے اس کے تناظر میں ایم ایم اے کی حکمت عملی دیکھیے۔جنرل مشرف کے ساتھ ایم ایم اے کے تعاون کے پورے عمل کو دیکھیے فضل الرحمان صاحب وزیراعظم بن رہے تھے جنرل صاحب نے انھیں ایک ووٹ پر ہروادیا اس کی تفصیل ہم لکھ چکے ہیں اس پوری تاریخ، پس منظر اور تناظر میں یہی طریقہ نظر آتا ہے کہ ایم ایم اے اور دینی جماعتیں جمہوریت جمہوری عمل اور اقتدار و اختیار کو تمام امور پر فوقیت دیتی ہیں ان کی اولین ترجیح Prcority جمہوریت ہے باقی تمام امور ثانوی ترجیح Second Priority یہی ان کی سب سے بڑی اجتہادی غلطی ہے جس کا ازالہ امالہ انہی کو کرنا ہوگا اگر یہ اس غلط اجتہاد سے رجوع نہیں کریں گے تو ان کا رویہ مزید ابتری کو جنم دے گا ستر سال کے تجربے کے بعد بھی اگر دینی سیاست اپنے رویے طریقے مزاج کو بدلنے پر تیار نہیں تو یہ المیہ ہوگا انتخابات، سیاست، اقتدار تک پہنچنے کی ایک حکمت عمی تھی اس حکمت عملی میں تمام طریقے اختیار کرلیے گئے مگر بات بن نہیں سکی لہٰذا اب دوسرے راستے اختیار کیے جائیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے حکمت علمی کو عقیدہ کا درجہ دے دیا ہے عقیدے کو دوسرا عقیدہ ہی تبدیل کرسکتا ہے

علماء نے ابھی تک عملی طور پر اس حکمت عملی یعنی جمہوریت کو ہمارے علم کے مطابق عقیدے کا درجہ نہیں دیا ہے لہٰذا یہ حکمت عملی تبدیل کی جاسکتی ہے۔اور اسے تبدیل ہونا چاہیے حکمت عملی تو تجربات کے ذریعے جانچی پرکھی جاتی ہے غامدی صاحب نے تو جمہوریت کو عقیدے میں شامل کرلیا ہے۔

سوال: روز نامہ جسارت یکم اگست میں مولانا فضل الرحمان کا بیان شائع ہوا ہے کہ انہوں نے فوج کے سربراہ جنرل باجوہ کے اس بیان کی وضاحت طلب کی ہے کہ انتخابات میں دشمن کوشکست دینے سے ان کی کیا مراد ہے مولانا نے کہا کہ امریکہ نے بھی بیان دے دیا ہے کہ پاکستانی انتخابات میں مذہبی انتہا پسندوں کوشکست ہوئی ہے لہٰذا اس امریکی بیان کے بعد آرمی چیف کے بیان کی وضاحت اور بھی ضروری ہوگئی ہے آرمی چیف نے بیان دیا ہے کہ ووٹ کے ذریعے دشمن کوشکست دی گئی ہے۔وہ بتائیں کہ وہ کس کو دشمن کہہ رہے ہیں وہ کسے دشمن سمجھتے ہیں ان کی نظر میں دشمن کون ہے؟ (جسارت یکم اگست ۲۰۱۸ء] مولانا کے اس جرات مندانہ بیان پر ریاست کا ردعمل کیا ہے؟

جواب: ریاست نے اس بیان کو ردعمل کے قابل بھی نہیں سمجھا۔فیض آباد دھرنے میں تو باجوہ صاحب خود انتہا پسندوں کے معاہدے میں ضامن کے طور پر شامل ہوئے فون پر مولانا خادم رضوی سے پوچھا کہ مولانا آپ کیا مانگتے ہیں جو مانگیں گے وہ دیا جائے گا مولانا نے شاہد حامد کا استعفیٰ مانگا وہ مل گیا انہوں نے کہا مقدمات واپس لیے جائیں وہ لے لیے گئے سینٹ نے جنرل باجوہ صاحب کو بلایا وضاحت طلب کی معاہدہ میں آپ ماورائے آئین فریق کیوں بنے؟ جنرل صاحب نے کہا ہم یہ نہ کرتے تو خانہ جنگی ہوجاتی نواز شریف حکومت ناکام ہو چکی تھی اجلاس میں معلوم ہوا کہ شہباز شریف خود اس دھرنے کو کامیاب کرا رہے تھے پنجاب پولیس سختی نہیں کر رہی تھی۔احسن اقبال کی حکمت عملی میں شہباز شریف تعاون نہیں کر رہے تھے۔(جاری ہے)